رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰

رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۵

جلد (۹) عدد (۴)

شوال المکرم ۱۳۵۵ھ

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت فی پرچہ (۸/)

قیمت سالانہ (صہ)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابو الاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب بودھ مت مسیحیت یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو ہی نہیں بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت ۳؎ بلا جلد (للعہ) انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت ۵؎ انگریزی ۴؎ سکہ عثمانیہ)

فہرست مضامین

ماہ شوال سنہ ۱۳۵۵ھ جلد ۹۔ عدد ۴

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۴۲
مقالات		
کفر و ایمان	جناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی	۲۵۷
سدباب ذریعہ (ترجمہ)	علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ	۲۷۵
صدر اسلام میں فتوے کی حیثیت	جناب مولوی عثمان عمادی صاحب	۲۹۰
تنزیل و تاویل		
تفسیر آیۂ ما کان لنبی ان یکون لہ اسریٰ	جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی	۳۰۰
مطبوعات		۳۱۸

ضرورت: ادارہ ترجمان القرآن کو رسالہ ہٰذا کے حسب ذیل نمبروں کی ضرورت ہے۔

محرم سنہ ۱۳۵۲ھ شعبان و رمضان سنہ ۱۳۵۲ھ محرم و صفر سنہ ۱۳۵۴ھ۔ ربیع الاول و ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۴ھ

جو حضرات ان پرچوں کو فروخت کرنا چاہیں وہ دفتر سے مراسلت فرمائیں۔

منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

تھوڑی دیر کے لیے جسمانی آنکھیں بند کر کے تصور کی آنکھیں کھول لیجیے اور ایک ہزار چار سو برس پیچھے پلٹ کر دنیا کی حالت پر ایک نظر ڈالیے۔ یہ کیسی دنیا تھی؟ انسان اور انسان کے درمیان تبادلۂ خیال کے وسائل کس قدر کم تھے۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق کے ذرائع کتنے محدود تھے۔ انسان کی معلومات کس قدر کم تھیں اس کے خیالات کس قدر تنگ تھے۔ اس پر وہم اور توحّش کا کس قدر غلبہ تھا۔ جہالت کے اندھیرے میں علم کی روشنی کتنی دھندلی تھی۔ اور اس اندھیرے کو دھکیل دھکیل کر کتنی دقتوں کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ دنیا میں نہ تار تھا۔ نہ ٹیلیفون تھا نہ ریڈیو تھا۔ نہ ریل اور ہوائی جہاز تھے۔ نہ مطابع اور اشاعت خانے تھے۔ نہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت نہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے تھے۔ نہ کتابیں کثرت سے لکھی جاتی تھیں نہ کثرت سے ان کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے ایک عالم کی معلومات بھی بعض حیثیات سے موجودہ زمانہ کے ایک عامی کی بہ نسبت کم تھیں۔ اس زمانہ کی اونچی سوسائٹی کا آدمی بھی موجودہ زمانے کے ایک مزدور کی بہ نسبت کم شائستہ تھا۔ اس زمانہ کا ایک نہایت روشن خیال آدمی بھی آج کل کے تاریک خیال آدمی سے زیادہ تاریک خیال تھا۔ جو باتیں آج ہر کس و ناکس کو معلوم ہیں۔ وہ اس زمانے میں برسوں کی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد بھی بمشکل معلوم ہو سکتی تھیں۔ جو معلومات آج روشنی کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی ہیں اور ہر بچہ کو ہوش سنبھالتے ہی حاصل ہو جاتی ہیں ان کے لئے اس زمانے میں سینکڑوں میل کے سفر کیے جاتے تھے اور عمریں ان کی جستجو میں بسر ہو جاتی تھیں جن باتوں کو آج اوہام و خرافات سمجھا جاتا ہے وہ اس زمانے کے "حقائق" تھے جن افعال کو آج ناشائستہ اور وحشیانہ کہا جاتا ہے وہ اس زمانہ کے معمولات تھے جن طریقوں سے آج انسان کا ضمیر نفرت کرتا ہے وہ اس

زمانہ کے اخلاقیات میں نہ صرف جائز تھے بلکہ کوئی شخص یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ ان کے خلاف بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔ انسان کی عجائب پرستی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ کسی چیز میں اس وقت تک کوئی صداقت کوئی بزرگی کوئی پاکیزگی تسلیم ہی نہ کر سکتا تھا جب تک کہ وہ فوق الفطرت نہ ہو، خلاف عادت نہ ہو، غیر معمولی نہ ہو۔ حتیٰ کہ انسان خود اپنے آپ کو اس قدر ذلیل سمجھتا تھا کہ کسی انسان کا خدا رسیدہ ہونا اور کسی خدا رسیدہ ہستی کا انسان ہونا اس کے تصور کی رسائی سے بہت دور تھا۔

اس تاریک دور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تسلط اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ جو ممالک اس زمانہ کے معیار تمدن کے لحاظ سے متمدن تھے ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد ایران، روم، اور مصر کے ملکوں میں علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی، مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی راہ طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے۔ اور صرف اموال کا مبادلہ کر کے واپس آ جاتے تھے۔ علم و تہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ ان کے ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا، نہ کتب خانہ تھا، نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا۔ نہ علوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنہیں کچھ لکھنا پڑھنا آتا تھا مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ اس زمانہ کے علوم و فنون سے آشنا ہوتے۔ ان کے پاس ایک اعلیٰ درجہ کی شائستہ زبان ضرور تھی جس میں بلند خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا مگر ان کے لٹریچر کے جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کس قدر محدود تھیں، تہذیب و تمدن میں ان کا درجہ کس قدر پست تھا، ان پر اوہام کا کس قدر غلبہ تھا، ان کے خیالات اور ان کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ کوئی ضابطہ اور قانون نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا۔ اور

صرف "جنگل کے قانون" کی پیروی کی جاتی تھی جس کا بس پر بس چلتا اسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قابض ہو جاتا۔ یہ بات ایک عرب بدوی کے فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اس کے قبیلہ کا نہیں اسے وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اس کے مال پر کیوں نہ متصرف ہو جائے۔

اخلاق اور تہذیب اور شائستگی کے جو کچھ بھی تصورات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی نہایت گندی تھی۔ ان کے طریقے وحشیانہ تھے۔ زنا اور جوے اور شراب اور چوری اور رہزنی اور قتل ان کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف برہنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عورتیں تک ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ کھانے اور لباس اور طہارت کے معمولی آداب تک سے وہ ناواقف تھے۔

مذہب کے باب میں وہ تمام ان جہالتوں اور ضلالتوں کے حصہ دار تھے جن میں اس زمانہ کی دنیا مبتلا تھی۔ بت پرستی، ارواح پرستی، کواکب پرستی، غرض ایک خدا کی پرستش کے سوا اس وقت دنیا میں جتنی "پرستیاں" پائی جاتی تھیں وہ سب ان میں رائج تھیں۔ انبیاء قدیم اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم ان کے پاس نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ ان کے باپ ہیں مگر یہ نہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عاد اور ثمود کے قصے بھی ان میں مشہور تھے، مگر ان کی جو روایتیں عرب کے مورخین نے نقل کی ہیں ان کو پڑھ جائیے کہیں آپ کو صالحؑ اور ہودؑ کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ ان کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے انبیاء بنی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں، مگر وہ جیسی کچھ تھیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر ان اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو مفسرین اسلام نے نقل کی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل عرب اور خود بنی اسرائیل جن انبیاء سے واقف تھے وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق ان لوگوں کا تصور کس قسم کا تھا۔

ایسے زمانہ میں ایسے ملک میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے بچپن ہی میں ماں باپ اور دادا کا سایہ اس کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔ اس لیے اُس گئی گذری حالت میں ایک عرب بچے کو جو تھوڑی بہت تربیت مل سکتی تھی وہ بھی اس کو نہیں ملتی۔ ہوش سنبھالتا ہے تو بدوی لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو سوداگری میں لگ جاتا ہے۔ اٹھنا بیٹھنا ملنا جلنا انہی عربوں کے ساتھ ہے جن کا حال اوپر آپ نے دیکھ لیا۔ تعلیم کا نام تک نہیں حتیٰ کہ پڑھنا لکھنا تک نہیں آتا۔ کسی عالم کی صحبت بھی میسر نہ ہوئی کہ "عالم" کا وجود اس وقت تمام عرب میں کہیں نہ تھا۔ چند مرتبہ اُسے عرب سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق ضرور ہوا، مگر یہ سفر صرف شام کے علاقہ تک تھے اور ویسے ہی تجارتی سفر تھے جیسے اس زمانہ میں عرب کے تجارتی قافلے کیا کرتے تھے۔ بالفرض اگر ان اسفار کے دوران میں اس نے کچھ آثار علم و تہذیب کا مشاہدہ کیا ہو اور کچھ اہل علم سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے منتشر مشاہدات اور ایسی ہنگامی ملاقاتوں سے کسی انسان کی سیرت نہیں بن جاتی ان کا اثر کسی شخص پر اتنا زبردست نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل آزاد، بالکل مختلف، اور اس قدر بلند ہو جائے کہ اس میں اور اس کے ماحول میں کوئی نسبت ہی نہ رہے۔ ان سے ایسا علم حاصل ہونا ممکن نہیں جو ایک ان پڑھ بدوی کو ایک ملک کا نہیں تمام دنیا کا اور ایک زمانہ کا نہیں تمام زمانوں کا لیڈر بنا دے اگر کسی درجہ میں اس نے باہر کے لوگوں سے علمی استفادہ کیا بھی ہو تو جو معلومات اس وقت دنیا میں کسی کو حاصل ہی نہ تھیں، مذہب، اخلاق، تہذیب اور تمدن کے جو تصورات اور اصول اس وقت دنیا میں کہیں موجود ہی نہ تھے، انسانی سیرت کے جو نمونے اس وقت کہیں پائے ہی نہ جاتے تھے، ان کے حصول کا تو کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا

صرف عرب ہی کا نہیں بلکہ تمام دنیا کا ماحول پیش نظر رکھیے اور دیکھیے۔ یہ شخص جن لوگوں میں پیدا ہوا، جن میں بچپن گذارا، جن کے ساتھ پل کر جوان ہوا، جن سے اس کا میل جول رہا، جن سے اس کے معاملات رہے، ابتدا ہی سے عادات میں، اخلاق میں، خیالات میں وہ ان سب سے بالکل مختلف نظر آتا ہے، وہ کبھی جھوٹ

نہیں بولتا۔ اس کی صداقت پر اس کی ساری قوم گواہی دیتی ہے اس کے کسی بدترین دشمن نے بھی کبھی اس پر یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ فلاں موقع پر جھوٹ بولا تھا۔ وہ کسی سے بدکلامی نہیں کرتا کسی نے اس کی زبان سے کبھی گالی یا کوئی فحش بات نہیں سنی۔ وہ لوگوں سے ہر قسم کے معاملات کرتا ہے مگر کبھی کسی سے تلخ کلامی اور تُو تُو مَیں مَیں کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کی زبان میں سختی کے بجائے شیرینی ہے اور وہ بھی ایسی کہ جو اس سے ملتا ہے گرویدہ ہوجاتا ہے۔ وہ کسی سے بدمعاملگی نہیں کرتا۔ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ برسوں سوداگری کا پیشہ کرنے کے باوجود کسی کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقہ سے نہیں لیتا۔ جن لوگوں سے اس کے معاملات پیش آتے ہیں وہ سب اس کی ایمانداری پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ ساری قوم اس کو "امین" کہتی ہے دشمن تک اس کے پاس اپنے قیمتی مال رکھواتے ہیں اور وہ ان کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ بے حیا لوگوں کے درمیان وہ ایسا حیادار ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے اس کو برہنہ نہیں دیکھا۔ بد اخلاقوں کے درمیان وہ ایسا پاکیزہ اخلاق ہے کہ کبھی کسی اجنبی عورت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا، شراب اور جوے کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ ناشایستہ لوگوں کے درمیان وہ ایسا شایستہ ہے کہ ہر بدتمیزی اور ہر گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کے ہر کام میں ستھرائی اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ سنگدلوں کے درمیان وہ ایسا نرم دل ہے کہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتا ہے۔ مسافروں کی میزبانی کرتا ہے کسی کو اس سے دکھ نہیں پہونچتا اور وہ دوسروں کی خاطر دکھ اٹھاتا ہے۔ وحشیوں کے درمیان وہ ایسا صلح پسند ہے کہ اپنی قوم میں فساد اور خونریزی کی گرم بازاری دیکھ کر اس کو اذیت ہوتی ہے۔ اپنے قبیلہ کی لڑائیوں سے دامن بچاتا ہے اور مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش رہتا ہے۔ بت پرستوں کے درمیان وہ ایسا سلیم الفطرت اور صحیح العقل ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز اسے پوجنے کے لائق نظر نہیں آتی۔ کسی مخلوق کے آگے اس کا سر نہیں جھکتا۔ بتوں کے چڑھاوے کا کھانا بھی قبول نہیں کرتا۔ اس کا دل خود بخود شرک اور مخلوق پرستی سے نفرت کرتا ہے۔

اس ماحول میں یہ شخص ایسا ممتاز نظر آتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن ہے یا پتھروں کے ڈھیر میں ایک ہیرا چمک رہا ہے۔

تقریباً چالیس سال تک ایسی پاک صاف، شریفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے۔ وہ اس تاریکی سے گھبرا اٹھتا ہے جو اس کو ہر طرف محیط نظر آرہی تھی۔ وہ جہالت بداخلاقی بدکرداری، بدنظمی، شرک اور بت پرستی کے اس ہولناک سمندر سے نکل جانا چاہتا ہے جو اس کو گھیرے ہوئے تھا اس ماحول میں کوئی چیز بھی اس کو اپنی طبیعت کے مناسب نظر نہیں آتی۔ وہ سب سے الگ ہو کر آبادی سے دور پہاڑوں کی صحبت میں جا جا کر بیٹھنے لگتا ہے۔ تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گزارتا ہے، روزے رکھ رکھ کر اپنی روح اور اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے۔ سوچتا ہے؛ غور و فکر کرتا ہے، کوئی ایسی روشنی ڈھونڈھتا ہے جس سے وہ اس چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی کو دور کر دے۔ ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جس سے اس بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر پھر سے سنوار دے۔

یکایک اس کی حالت میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہوتا ہے۔ ایک دم سے اس کے دل میں وہ روشنی آجاتی ہے جو پہلے اُس میں نہ تھی۔ اچانک اس کے اندر وہ طاقت بھر جاتی ہے جس سے وہ اس وقت تک خالی تھا۔ وہ غار کی تنہائی سے نکل آتا ہے۔ اپنی قوم کے پاس آتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ یہ بت کسی کام کے نہیں انہیں چھوڑ دو۔ یہ زمین، یہ چاند، یہ سورج، یہ ستارے، یہ زمین اور آسمان کی ساری قوتیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہی تمہارا پیدا کرنے والا ہے، وہی رزق دینے والا ہے، وہی مارنے اور جلانے والا ہے۔ سب کو چھوڑ کر اسی کو پوجو۔ سب کو چھوڑ کر اسی سے حاجتیں طلب کرو۔ یہ چوری، یہ لوٹ مار، یہ قتل و خون، یہ ظلم و ستم، یہ بدکاریاں جو تم کرتے ہو۔ سب گناہ ہیں۔ انھیں چھوڑ دو۔ خدا انھیں پسند نہیں کرتا

سچ بولو، انصاف کرو، نہ کسی کی جان لو نہ کسی کا مال چھینو، جو کچھ لو حق کے ساتھ لو، جو کچھ دو حق کے ساتھ دو۔ تم سب انسان ہو۔ انسان اور انسان سب برابر ہیں۔ نہ کوئی ذلت کا داغ لے کر پیدا ہوا اور نہ کوئی عزت کا تمغہ لے کر دنیا میں آیا ہے۔ بزرگی اور شرافت نسل اور نسب میں نہیں۔ صرف خدا پرستی اور نیکی اور پاکیزگی میں ہے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے نیک اور پاک ہے وہی اعلیٰ درجہ کا انسان ہے اور جو ایسا نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ مرنے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے۔ اس عادل حقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی، نہ رشوت چلیگی، نہ کسی کا نسب پوچھا جائے گا۔ وہاں صرف ایمان اور نیک عمل کی پوچھ ہوگی۔ جس کے پاس یہ سامان ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور جس کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہ ہوگا وہ نامراد دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

جاہل قوم اس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ پتھر مارتی ہے۔ ایک دن دو دن نہیں، اکٹھے تیرہ برس تک اس پر سخت سے سخت ظلم توڑتی ہے، یہاں تک کہ اسے وطن سے نکال باہر کرتی ہے، اور پھر نکالنے پر بھی دم نہیں لیتی، جہاں وہ جا کر پناہ لیتا ہے وہاں بھی اسے ہر طرح ستاتی ہے، تمام عرب کو اس کے خلاف ابھار دیتی ہے اور کامل آٹھ برس اس کے خلاف برسر پیکار رہتی ہے۔ وہ ان سب تکلیفوں کو سہتا ہے مگر اپنی بات سے نہیں ہٹتا۔

یہ قوم اس کی کیوں دشمن ہوئی؟ کیا زر اور زمین کا کوئی جھگڑا تھا؟ کیا خون کا کوئی دعویٰ تھا؟ کیا وہ ان سے کوئی چیز مانگ رہا تھا؟ نہیں۔ ساری دشمنی اس بات پر تھی کہ وہ خدا پرستی اور تقویٰ اور نیکوکاری کی تعلیم کیوں دیتا ہے؟ بت پرستی اور شرک اور بدعملی کے خلاف تبلیغ کیوں کرتا ہے؟ حق کا سیدھا راستہ کیوں دکھاتا ہے؟ قوم کہتی تھی کہ یہ باتیں جو تو کہہ رہا ہے ہم نے اپنے باپ دادا سے کبھی نہیں سنیں اس لیے تو ان کو سنانا چھوڑ دے ورنہ ہم تیرا جینا تنگ کر دیں گے۔

اچھا۔ تو اس شخص نے یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں؟ قوم اس کو بادشاہی دینے پر آمادہ تھی، دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں ڈالنے کو تیار تھی بشرطیکہ وہ اپنی اس تعلیم سے باز آجائے، مگر اس نے ان سب کو ٹھکرا دیا اور اپنی تعلیم کی خاطر پتھر کھانا اور ظلم سہنا قبول کیا یہ آخر کیوں؟ کیا ان کے خدا پرست اور نیکوکار بن جانے میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ تھا؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کے مقابلہ میں ریاست اور امارت اور دولت اور عیش کے سارے لالچ بھی ناقابل التفات تھے؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کی خاطر ایک شخص سخت سے سخت جسمانی اور روحانی اذیتوں میں مبتلا ہونا اور کامل ۱۳ سال مبتلا رہنا بھی گوارا کرسکتا ہو؟ غور کرو! کیا نیک نفسی ایثار اور ہمدردی بنی نوع کا اس سے بھی بلند تر کوئی مرتبہ تمہارے تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فائدہ کی خاطر نہیں، دوسروں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں اٹھائے؟ جن کی بھلائی اور بہتری کے لئے وہ کوشش کرتا ہے، وہی اس کو پتھر ماریں گالیاں دیں، گھر سے بے گھر کردیں غریب الوطنی میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں، اور ان سب باتوں پر بھی وہ ان کا بھلا چاہنے سے باز نہ آئے۔

پھر دیکھو! کیا کوئی جھوٹا شخص کسی بے اصل بات کے پیچھے ایسی مصیبتیں برداشت کرسکتا ہے؟ کیا کوئی تیر تکے لڑانے والا انسان محض گمان اور قیاس سے کوئی بات کہکر اس پر اتنا جم سکتا ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ اس پر ٹوٹ جائیں، زمین اس پر تنگ کردی جائے، تمام ملک اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو، بڑی بڑی فوجیں اس پر امنڈ امنڈ کر آئیں، مگر وہ اپنی بات سے یک سرمو ہٹنے پر آمادہ نہ ہو؟ یہ استقامت یہ عزم، یہ ثبات خود گواہی دے رہا ہے کہ اس کو اپنی صداقت پر یقین اور کامل یقین تھا۔ اگر اس کے دل میں شک اور تذبذب کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو وہ مسلسل ۲۱ سال تک مصائب کے ان پے در پے طوفانوں کے مقابلہ میں کبھی نہ ٹھیر سکتا۔

یہ تو اس شخص کے انقلاب حال کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔

چالیس برس کی عمر تک وہ ایک عرب تھا عام عربوں کی طرح۔ اس دوران میں کسی نے اس سوداگر کو ایک خطیب، ایک جادوبیان مقرر کی حیثیت سے نہ جانا کسی نے اس کو حکمت اور دانائی کی باتیں کرتے نہ سنا کسی نے اس کو الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق اور قانون اور سیاسیات اور معاشیات اور عمرانیات کے مسائل پر بحث کرتے نہ دیکھا کسی نے اس کو ایک جنرل تو درکنار ایک اچھے سپاہی کی حیثیت سے بھی نہ جانا۔ کسی نے اس سے خدا اور ملائکہ اور آسمانی کتابوں اور پچھلے انبیاء اور امم قدیمہ اور قیامت اور حیات بعد الموت اور دوزخ اور جنت کے متعلق ایک لفظ بھی سنا۔ وہ پاکیزہ اخلاق، شائستہ اطوار، اور بہترین سیرت تو ضرور رکھتا تھا، مگر چالیس برس کی عمر کو پہنچنے تک اس کی ذات میں کوئی ایک بھی غیر معمولی بات نہ پائی گئی جس سے لوگ متوقع ہوتے کہ یہ شخص اب کچھ بننے والا ہے۔ اس وقت تک جاننے والے اس کو محض ایک خاموش، امن پسند اور نہایت شریف انسان کی حیثیت سے جانتے تھے۔

مگر چالیس برس کے بعد جب وہ اپنے غار سے ایک نیا پیغام لے کر نکلا تو یکلخت اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اب وہ ایک حیرت انگیز کلام سنا رہا تھا جس کو سن کر سارا عرب مبہوت ہو گیا۔ اس کی شدت تاثیر کا یہ حال تھا کہ اس کے کٹر دشمن بھی اس کو سنتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں یہ دل میں اتر نہ جائے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زور بیان کا یہ عالم تھا کہ تمام قوم عرب کو جس میں بڑے بڑے شاعر خطیب اور زبان آوری کے مدعی موجود تھے اس نے چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا کہ تم سب مل کر ایک ہی فقرہ اس کے مانند بنا لاؤ، مگر کوئی اس کے معاوضہ کی جرأت نہ کر سکا۔ ایسا بے مثل کلام کبھی عرب کے کانوں نے سنا ہی نہ تھا۔

اب یکایک وہ ایک بے مثل حکیم، ایک لاجواب مصلح اخلاق و تمدن، ایک حیرت انگیز ماہر سیاست، ایک زبردست مقنن، ایک اعلیٰ درجہ کا جج، ایک بے نظیر سپہ سالار بن کر ظاہر ہوا۔ اس نے، اس ان پڑھ صحرانشین نے حکمت اور دانائی کی وہ باتیں کہنی شروع کر دیں جو نہ اس سے پہلے کسی نے کہی تھیں نہ اس کے بعد کوئی کہہ سکا

وہ اُمّی الٰہیات کے عظیم الشان مسائل پر فیصلہ کن تقریریں کرنے لگا تاریخ اقوام سے عروج و زوال امم کے فلسفہ پر لکچر دینے لگا۔ پرانے مصلحین کے کارناموں پر تبصرے اور مذاہب عالم پر تنقید اور اختلافات اقوام کے فیصلے کرنے لگا اخلاق اور تہذیب اور شائستگی کا درس دینے لگا۔

اس نے معاشرت اور معیشت، اور اجتماعی معاملات، اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق قوانین بنانے شروع کردیئے اور ایسے قانون بنائے کہ بڑے بڑے علماء و عقلاء برسوں کے غور و خوض اور عمر بھر کے تجربات کے بعد بمشکل ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتے ہیں اور دنیا کے تجربات جتنے زیادہ بڑھتے جاتے ہیں ان کی حکمتیں اور زیادہ کھلتی جاتی ہیں۔

وہ خاموش پرامن سوداگر جس نے تمام عمر کبھی تلوار نہ چلائی تھی کبھی کوئی فوجی تربیت نہ پائی تھی حتیٰ کہ جو عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ ایک لڑائی میں محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا، دیکھتے دیکھتے وہ ایک ایسا بہادر سپاہی بن گیا جس کا قدم سخت سے سخت معرکوں میں بھی اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹا، ایسا زبردست جنرل بن گیا جس نے ۹ سال کے اندر تمام ملک عرب کو فتح کرلیا، ایسا حیرت انگیز ملٹری لیڈر بن گیا کہ اس کی پیدا کی ہوئی فوجی تنظیم اور جنگی روح کے اثر سے بے سروسامان عربوں نے چند سال میں دنیا کی دو عظیم الشان فوجی طاقتوں کو الٹ کر رکھ دیا۔

وہ الگ تھلگ رہنے والا سکون پسند انسان جس کے اندر کسی نے چالیس برس تک سیاسی دلچسپی کی بو بھی نہ پائی تھی یکایک اتنا زبردست ریفارمر اور مُدبّر بن کر ظاہر ہوا کہ ۲۳ سال کے اندر اس نے ۱۲ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ریگستان کے منتشر، جنگجو، جاہل، سرکش، غیر متمدن اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والے قبائل کو ریل اور تار اور ریڈیو اور پریس کی مدد کے بغیر ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک قانون اور ایک نظام حکومت کا تابع بنا دیا۔ اس نے ان کے خیالات بدل دیے، ان کے خصائل بدل دیے، ان کے اخلاق بدل دیے۔ ان کی ناشائستگی کو اعلیٰ درجہ کی شائستگی میں، ان کی وحشت کو بہترین مدنیت میں، ان کی کرداری

اور بد اخلاقی کو صلاح و تقویٰ اور مکارم اخلاق میں، ان کی سرکشی اور انکار کو انتہا درجہ کی پابندی قانون اور اطاعت امر میں تبدیل کر دیا، اور اس بانجھ قوم کو جس کی گود میں صدیوں سے کوئی ایک بھی قابل ذکر انسان پیدا نہ ہوا تھا، ایسا مردم خیز بنا دیا کہ اس میں سے ہزار در ہزار اعاظم رجال اٹھ کھڑے ہوئے اور دنیا کو دین اور اخلاق، اور تہذیب کا درس دینے کے لیے چار دانگ عالم میں پھیل گئے۔

اور یہ کام اس نے ظلم اور جبر اور دغا اور فریب سے انجام نہیں دیا بلکہ دل موہ لینے والے اخلاق اور روحوں کو مسخر کر لینے والی شرافت اور دماغوں پر قبضہ کر لینے والی تعلیم سے انجام دیا۔ اس نے اپنے اخلاق سے دشمنوں کو دوست بنایا، رحم اور شفقت سے دلوں کو موم کیا، عدل اور انصاف سے حکومت کی، حق اور صداقت سے کبھی یک سرمو انحراف نہ کیا، جنگ میں بھی کسی سے بدعہدی اور دغا نہ کی، اپنے بدترین دشمنوں پر بھی ظلم نہ کیا، جو اس کے خون کے پیاسے تھے، جنہوں نے اس کو پتھر مارے تھے، اس کو وطن سے نکالا تھا، اس کے خلاف تمام عرب کو کھڑا کر دیا تھا ان کو بھی اس نے فتح پا کر بخش دیا اور کسی سے بدلہ نہ لیا۔ ان سب باتوں کے ساتھ اس کے ضبط نفس بلکہ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ تمام ملک کا بادشاہ ہو گیا اس وقت بھی وہ جیسا فقیر تھا ویسا ہی فقیر رہا۔ بوریے پر سوتا تھا، موٹا جھوٹا پہنتا تھا، غریبوں کی سی غذا کھاتا تھا، فاقے تک کر گذرتا تھا، رات رات بھر اپنے خدا کی عبادت میں کھڑا رہتا تھا، غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرتا تھا اور ایک مزدور کی طرح کام کرنے میں بھی اسے تامل نہ تھا۔ آخر وقت تک اس کے اندر شاہانہ تمکنت اور امیرانہ ترفع اور بڑے آدمیوں کے سے تکبر کی ذرا سی بو بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ ایک عام آدمی کی طرح لوگوں سے ملتا تھا ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا، اور اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرتا تھا کہ گویا وہ اُسی جیسا ایک انسان ہے۔

ابھی اس عظیم الشان آدمی کے کمالات کی فہرستِ ختم نہیں ہوی۔ اُس کے مرتبہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے آپ کو تاریخ عالم پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ آپ دیکھینگے کہ صحرائے عرب کا یہ اَنپڑھ بادیہ نشین جو ۱۳ سو برس پہلے اُس تاریک دور میں پیدا ہوا در اصل دورِ جدید کا بانی اور تمام دنیا کا لیڈر ہے وہ نہ صرف ان کا لیڈر ہے جو اسے لیڈر مانتے ہیں، بلکہ ان کا بھی ہے جو اسے نہیں مانتے۔ ان کو اس امر کا احساس تک نہیں کہ جس کے خلاف وہ زبان کھولتے ہیں اس کی رہنمائی کس طرح اس کے خیالات میں ان کے اصولِ حیات اور قوانین عمل میں اور ان کے عصر جدید کی روح میں پیوست ہو گئی ہے۔

یہی شخص ہے جس نے دنیا کے تصورات کا رخ وہمیت اور عجائب پرستی اور رہبانیت کی طرف سے عقلیت اور حقیقت پسندی اور متقیانہ دنیاداری کی طرف پھیر دیا۔ اسی نے حسی معجزے مانگنے والی دنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور انہی کو معیارِ صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اُسی نے خرقِ عادت میں خدا کی خدائی کے آثار ڈھونڈھنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور انھیں آثارِ فطرت میں آیاتِ الٰہی دیکھنے کا خوگر بنایا۔ اسی نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو تعقل اور تفکر اور مشاہدہ اور تحقیق کے راستہ پر لگایا۔ اسی نے عقل اور حس اور وجدان کے امتیازی حدود انسان کو بتائے، مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی، دین سے علم و عمل کا اور علم و عمل سے دین کا ربط قائم کیا، مذہب کی طاقت سے دنیا میں سائنٹیفک اسپرٹ اور سائنٹیفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی۔ اسی نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا اور علم کی طاقت سے توحید کا اعتقاد ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا کہ مشرکوں اور بت پرستوں کے مذہب بھی وحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اسی نے اخلاق اور روحانیت کے بنیادی تصورات کو بدلا۔ جو لوگ ترکِ دنیا اور نفس کشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے جن کے نزدیک نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیوی زندگی کے معاملات میں حصہ لینے کے ساتھ روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی ان کو اسی نے تمدن اور حضارت اور دنیوی عمل کے اندر فضیلتِ اخلاق اور ارتقائے روحانی اور حصولِ نجات کا راستہ دکھایا۔

پھر وہی ہے جس نے انسان کو اس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ جو لوگ بھگوان اور اوتار اور ابن اللہ کے سوا کسی کو ہادی و رہنما تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے ان کو اسی نے بتایا کہ انسان اور انہی جیسا انسان آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور خداوند عالم کا خلیفہ ہو سکتا ہے، اور جو لوگ طاقتور انسانوں کو ارباب من دون اللہ بناتے تھے ان کو اسی نے سمجھایا کہ انسان بجز انسان کے اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص تقدس اور حکمرانی اور آقائی کا پیدائشی حق لے کر آیا ہے، اور نہ کسی پر ناپاکی اور محکومیت اور غلامی کا پیدائشی داغ لگا ہوا ہے۔ اسی تعلیم نے دنیا میں وحدتِ انسانی، اور مساوات اور جمہوریت، اور آزادی کے تخیلات پیدا کیے ہیں۔

تصورات سے آگے بڑھیے۔ آپ کو اس امی کی لیڈر شپ کے عملی نتائج دنیا کے قوانین اور طریقوں اور معاملات میں اس کثرت سے نظر آئیں گے کہ ان کا شمار مشکل ہو جائے گا۔ اخلاق اور تہذیب اور شائستگی اور طہارت، اور نظافت کے کتنے ہی اصول ہیں جو اس کی تعلیم سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ معاشرت کے جو قوانین اس نے بنائے تھے، دنیا نے کس قدر ان کی خوشہ چینی کی اور اب تک کیے جا رہی ہے۔ معاشیات کے جو اصول اس نے سکھائے تھے ان سے دنیا میں کتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور اب تک پیدا ہوئے جا رہی ہیں۔ حکومت کے جو طریقے اس نے اختیار کیے ان سے دنیا کے سیاسی نظریات میں کتنے انقلاب برپا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ عدل اور قانون کے جو اصول اس نے وضع کیے انہوں نے دنیا کے عدالتی نظامات اور قانونی افکار کو کس قدر متاثر کیا اور اب تک ان کی تاثیر خاموشی کے ساتھ جاری ہے۔ جنگ اور صلح اور بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب جس شخص نے عملاً دنیا میں قائم کی وہ دراصل یہی عرب کا امی ہے، ورنہ پہلے دنیا اس سے ناواقف تھی کہ جنگ کی بھی کوئی تہذیب ہو سکتی ہے، اور مختلف قوموں میں مشترک انسانیت کی بنیاد پر بھی معاملات ہو سکتے ہیں۔

آئیے اب اس سوال پر غور کیجیے کہ ۱۴ سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں، عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشہ میں، ایک گلہ بانی اور سوداگری کرنے والے اَن پڑھ بادیہ نشین کے اندر یکایک اتنا علم، اتنی روشنی اتنی طاقت، اتنے کمالات، اتنی زبردست تربیت یافتہ قوتیں پیدا ہو جانے کا کونسا ذریعہ تھا؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ سب اس کے اپنے دل و دماغ کی پیداوار تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اسی کے دل و دماغ کی پیداوار تھی تو اس کو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا اور اگر وہ ایسا دعویٰ کرتا تو وہ دنیا جس نے کرشن کو بھگوان قرار دینے میں تامل نہ کیا، جس نے بودھ کو خود بخود معبود بنالیا، جس نے مسیح کو آپ اپنی مرضی سے ابن اللہ مان لیا، جس نے آگ اور پانی اور ہوا تک کو پوج ڈالا وہ ایسے زبردست باکمال کو خدا مان لینے سے کبھی انکار نہ کرتی۔ مگر دیکھو وہ خود کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں سے ایک کا کریڈٹ بھی خود نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ میں ایک انسان ہوں تمہیں جیسا انسان۔ میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں۔ سب کچھ خدا کا ہے۔ اور خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ کلام جس کی نظیر لانے سے تمام نوع انسانی عاجز ہے، میرا کلام نہیں ہے، میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے۔ لفظ بلفظ خدا کی طرف سے میرے پاس آیا ہے اور اس کی ساری تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔ یہ کارنامے جو میں نے دکھائے، یہ قوانین جو میں نے وضع کیے، یہ اصول جو میں نے تمہیں سکھائے، ان میں سے کوئی چیز بھی میں نے خود نہیں گھڑی ہے۔ میں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر ہر چیز میں خدا کی رہنمائی کا محتاج ہوں۔ ادھر سے جو کچھ اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔

دیکھو! یہ کیسی حیرت انگیز صداقت ہے، کیسی امانت اور راست بازی ہے۔ جھوٹا انسان تو بڑا بننے کے لیے دوسروں کے ایسے کمالات کا کریڈٹ بھی لے لینے میں تامل نہیں کرتا جن کے اصل ماخذ کا پتہ بآسانی چل جاتا ہے۔ لیکن یہ شخص ان کمالات کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا جن کو اگر وہ اپنے کمالات کہتا تو کوئی اس کو جھٹلا نہ سکتا تھا کیونکہ کسی کے پاس ان کے اصل ماخذ تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔

سچائی کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے ؟ اس شخص سے زیادہ سچا اور کون ہوگا جس کو ایک نہایت مخفی ذریعہ سے ایسے بے نظیر کمالات حاصل ہوں، اور وہ بلا تکلف اپنے اصل ماخذ کا حوالہ دے دے؟ بتاؤ! کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں۔

ایڈیٹر معذرت خواہ ہے کہ اس مہینہ چند غیر معمولی مصروفیتوں کی وجہ سے ان مضامین کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا جو اس رسالہ میں مسلسل شائع ہو رہے تھے۔ انشاء اللہ ذی القعدہ کے پرچے میں اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

مقالات

کفر و ایمان

از جناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی

یہ عجیب بات ہے کہ کفر و ایمان جیسی واضح اور اہم شی کی شرعی حیثیت سمجھنے میں بھی حد درجہ افراط و تفریط برتی جا رہی ہے۔ اس کا واحد سبب کتاب و سنت کی تعلیمات سے روگردانی اور انحراف ہے قرآن حکیم جو مہیمن اور مصدق تمام کتب سماویہ و ادیان الٰہیہ کا ہے اس نے یہ اعلان پہلے دن کر دیا تھا:۔ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ الخ یہاں تک کہ باہمی تفرق اور تشتت سے بچنے اور تمام معاملات کو یکسو کرنے کے لیے صاف صاف فرما دیا:۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ الخ اتنے ہی پر ختم نہیں ہوا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی کے آخری لمحات میں تمام اسود و احمر کو یہ پیغام دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام امت مرحومہ کو ایک ایسے راستے پر چلا کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے ہیں کہ جس کی رات دن سے واضح تر ہے۔ لیکن آہ .....

بہرحال سطور ذیل میں کفر و ایمان پر چند شرعی تصریحات محض بخیال تحقیق مسئلہ پیش کی جاتی ہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا ایک زرین اصول

یہ بات معلوم کر لینا ہر شخص کے لیے نہایت ضروری ہے کہ تمام وہ الفاظ جو قرآن و حدیث کے اندر موجود ہیں جب ان کی تعریف و تفسیر خود شارع سے منقول ہو تو اس وقت اہل لغت وغیر اہل لغت کے محققانہ اقوال کو کسی استدلال کے سلسلہ میں بطور حجت پیش کرنا قابل قبول نہ ہوگا۔ خواہ وہ کیسی ہی بلند پایہ تحقیقات اور بصیرت افروز معلومات پر کیوں نہ مشتمل ہوں چنانچہ محض اسی

حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہا نے اسماء کی تین قسمیں کی ہیں۔

(۱) وہ جن کی تفسیر خود شرع نے کر دی ہے۔ جیسے نماز، زکوٰۃ وغیرہ۔

(۲) جن کی تعریف لغت کے توسط سے معلوم ہو جیسے شمس، قمر، وغیرہ۔

(۳) جن کی تعریف عرف عام کے ذریعہ سے جانی جائے جیسے لفظ قبض، معروف، آیت وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" وغیرہ میں وارد ہے۔

حضرت حبر الامۃ عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ تفسیر قرآن کے چار طریقے ہیں۔

ایک وہ جسے عرب اپنی خصوصیات کلام کی بنا پر سمجھتے ہیں۔

دوسرا وہ جو ہر خاص و عام کو معلوم ہے۔

تیسرا وہ جسے علماء جانتے ہیں۔

چوتھا وہ جسے صرف خدا جانتا ہے، اس لیے جو شخص اس کے علم کا دعویٰ کرے۔ سمجھنا چاہیے کہ جھوٹا ہے پس صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج، خمر، وغیرہ ان الفاظ میں ہیں جن کی بابت شارعؑ نے تصریح کر دی کہ قرآن و حدیث میں یہ کن مفاہیم میں مستعمل ہیں۔ اس لئے شارع کے بیان کے خلاف اگر کوئی تشریح کرے تو وہ قول مردود اور ناقابل قبول ہوگا۔ بقیہ لفظوں کا اشتقاق، الفاظ قرآنی کی حکمتیں، اور یہ کہ لفظ کی دلالت اپنے معنی پر کیسی ہے تو یہ تمام کی تمام علم بیان اور تعلیل احکام وغیرہ سے متعلق ہیں جو علوم زوائد میں ہیں جن پر فہم معانی کا مدار نہیں۔ چونکہ ایمان، اسلام، نفاق، کفر اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں تھیں اس لیے شارعؑ نے ان کے مفاہیم کو اتنی وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ اب ان پر اشتقاق لفظی اور شواہد استعمال عرب سے استدلال کی ضرورت ہی نہیں رہی پس ہر شخص پر واجب ہے کہ خدا اور خدا کے رسول نے ان اسماء کی جو تفسیر کی ہے اس کی طرف رجوع کرے[۱] (فانہ کاف شاف) انتہی۔

کفر کی اقسام | امام ابن تیمیہؒ کا مذکورہ بیان اپنی جگہ قول فیصل ہے تاہم مزید افادہ اور کفر و ایمان

[۱] کتاب الایمان لابن تیمیہ

کی حقیقت و استعمالات شرعی سمجھنے کے لیے چند نصوص پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۔ (آل عمران ۱۰۵ و ۱۰۶)

ان جیسے نہ ہو جو ایک دوسرے سے پھر گئے اور اپنے پاس بینات آنے کے بعد آپس میں اختلاف کرنے لگے یہی لوگ ہیں جن کو آخرت میں بڑا عذاب ہوگا۔ یاد کرو اس دن کو جس دن بعض منہ سفید ہو جائیں گے اور بعض سیاہ تو جو رو سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائیگا کہ تم ایمان لانے کے بعد کافر کیوں ہو گئے تھے؟ اب اپنے کفر کی سزا میں عذاب کے مزے چکھو۔

نظم کلام اور سیاق آیات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت بالا میں کفر سے کفر فعلی یعنی اختلاف و تفرق مذموم مراد ہے۔

(۲) وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۔ (مائدہ آیت ۴۴)

اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا ہے سو وہی لوگ کافر ہیں۔

"مَا أَنزَلَ اللَّهُ" پر نہ حکم کرنے سے غالباً یہ مراد ہے کہ منصوص حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور اس کے بجائے دوسرے احکام اپنی رائے اور اپنی خواہش سے تسلیم کرے جیسا کہ یہود نے بعض احکامات کے متعلق کیا تھا ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ اور اگر مراد یہ ہے کہ "ما انزل اللہ" کو عقیدۃً ثابت مان کر پھر فیصلہ عملاً اس کے خلاف کرے تو کافر سے مراد عملی کافر ہوگا یعنی اس کی عملی حالت کافروں جیسی ہے اسی بنا پر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اسی آیت کریمہ کے سوال پر یہ ارشاد فرمایا تھا۔ "لا ینقل عن الملۃ" یعنی ایسا شخص دین و ملت سے علیحدہ نہ ہوگا۔[۱]

(۳) مَن كَفَرَ بِاللَّهِ مِن بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ

جو کوئی ایمان لانے کے بعد کفر کرے بجز اس کے کہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو مگر جو لوگ

[۱] کتاب الایمان

وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ - (نحل آیت ۱۰۶)

کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب اور بھاری عذاب ہے۔

آیت مذکورہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مجبوری کے موقع پر جان بچانے کی خاطر سے صرف زبان سے کفر کا اقرار کر لینا بشرطیکہ اس وقت بھی قلب میں کوئی تردد نہ ہو ایسا شخص مسلمان ہی سمجھا جائیگا لیکن مقام عزیمت اس سے بلند تر ہے جیسا کہ حضرت بلالؓ حضرت یاسرؓ حضرت سمیہؓ حضرت حبیبؓ بن زید انصاری اور حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کے واقعات اسفار حدیث میں موجود ہیں۔

(۴) لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۔ (ابراہیم آیت ۷)

اگر احسان مانو گے تو تم کو اور بھی دونگا اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بہت ہی سخت ہے۔

(۵) وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (مائدہ آیت ۵)

اور جو ایمان کا انکار کردے تو اس کا عمل اکارت ہوا اور وہ آخرت میں خسارہ میں رہیگا۔

(۶) وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۔ (نساء آیت ۱۳۶)

جو کوئی انکار کرے گا اللہ کا اور ملائکہ کا اور کتابوں کا اور رسولوں کا اور روز قیامت کے دن کا تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں پڑا۔

یہ بات واضح ہے کہ جو اسلام قبول کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالی کے تمام احکامات پر دل سے یقین لائے اس کے ارشادات میں سے کسی ایک پر بھی یقین نہ لائے گا تو وہ مسلمان نہیں کیونکہ ظاہری اور صرف زبانی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

ارباب لغت بھی معنی شرعی کی تائید کرتے ہیں امام لغت راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔

اعظم الكفر جحود الوحدانية او الشريعة او النبوة والكفران في جحود النعمة

سب سے بڑا کفر وحدانیت کا انکار ہے یا شریعت کا یا محض نبوت کا لفظ کفران کو زیادہ تر جحود نعمت کے اور لفظ

اَکْثَرَ استعمالًا والکفر فی الدین اکثر و الکفور فیھما جمیعاً[1] — کفر کو انکار دین کے موقع پر بولتے ہیں لیکن لفظ کفور دونوں کو شامل ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

والکافر علی الاطلاق متعارف فیمن یجحد الوحدانیۃ او النبوۃ او الشریعۃ او ثلاثتھا۔ — اور مطلق لفظ کافر متعارف طور پر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو انکار وحدانیت یا نبوت یا شریعت یا تینوں کا کرے۔

قول فیصل یہ ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرے وہ کافر ہے اور ہمیشہ جہنم میں رہے گا[2]۔ کیونکہ احکام ضروریہ کا قبول اور یقین نہ کرنا ہی آپ کی تکذیب ہے۔

حدیثوں میں بھی کفر کا اطلاق بہت سی چیزوں پر کیا گیا ہے حجۃ الوداع مقام عرفات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عظیم الشان خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

(۱) لاترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض (بخاری) — دیکھنا میرے بعد کافروں کی طرح نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

(۲) سباب المومن فسوق وقتالہ کفر (مسلم) — مومن کو گالی دینا گناہ اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔

(۳) ایما عبد ابق من موالیہ فقد کفر (〃) — جو غلام اپنے آقا سے نافرمان ہو کر بھاگ گیا اس نے کفر کیا۔

(۴) ان بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلوۃ (مسلم) — آدمی اور شرک و کفر میں حد فاصل نماز ہے۔ یعنی ترک کر دینا شرک و کفر ہے

(۵) من حلف بغیر اللہ فقد کفر (ترمذی) — جو شخص اللہ کے سوا کسی کی قسم کھائے وہ کافر ہے۔

---

[1] مفردات القرآن۔ [2] اقتصاد فی الاعتقاد للغزالی رحمہ اللہ۔

(۶) من رغب عن ابیہ فھو کفر (متفق علیہ) جو شخص اپنے باپ سے منہ پھیرے یعنی کسی اور کا کہلائے وہ کافر ہوا۔

(۷) من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر نماز کا قصداً ترک کر دینا کفر ہے۔

(۸) قال تکثرن اللعن وتکفرن العشیر (بخاری) آپ نے فرمایا تم بہت لعنت کرتی ہو اور اپنے خاوند کی ناسپاسی بھی بہت کرتی ہو۔

(۹) ولٰکما من قال مُطِرنا بنوء کذا وکذا فذالِکَ کافر بی مومن بالکواکب (مسلم) اور جس شخص نے کہا کہ ہم پر بسبب ایک ستارے کے غروب ہونے اور نکلنے کے پانی برسایا گیا ہے تو وہ شخص میرا منکر ہوا اور ستارے پر ایمان لانے والا ہوا۔

موخرالذکر حدیث کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر کسی کا یہ اعتقاد ہو کہ ستارے پانی برسانے کے فاعل اور مدبر ہیں جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا تو یہ عقیدہ کفر ہے۔ ہاں اگر یہ خیال و عقیدہ ہے کہ پانی برسانا اللہ کے فضل و رحمت سے ہے اور ستارے اس کی علامت اور نشانیاں ہیں تو یہ کفر نہیں ہے۔

اس کے بعد اب ہم علامہ ازہری امام لغت کی ایک فیصلہ کن گفتگو پیش کرتے ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں کہ کفر باللہ کی چار قسمیں ہیں۔ انکار، جحود، عناد، نفاق۔ اگر ان چاروں قسموں میں سے کسی ایک پر بھی خاتمہ ہوا تو جاننا چاہیے کہ اس کی مغفرت کی تمام تر توقعات بے سود ہوں گی۔ "انما الاعمال بالخواتیم"۔

تعریفات حسب ذیل ہیں۔

انکار، خدا کی معرفت و توحید کا زبان و قلب ہر ایک سے انکار کرنا جیسے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ الخ۔ بیشک جو لوگ کافر ہو چکے برابر ہے۔ ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہ لائیں گے۔

(۲) جحود، دل میں خدا کی عظمت وجلال کا تو یقین کرنا لیکن زبان سے اس کی تصدیق نہ کرنا جیسے ابلیس بلعام، اور اسیہ بن صلت کا کفر۔

(۳) عناد، دل میں خدا کی عظمت کا یقین اور زبان سے اقرار بھی کرنا لیکن ایمان بالتوحید اور انقیاد سے اباکرنا جیسے ابو طالب۔

(۴) نفاق، زبان سے تو ہر چیز کا اقرار کرنا لیکن دل میں کفر کا نشتر پوشیدہ رکھنا جیسے منافقین کا کفر۔

اس کے بعد علامہ موصوف فرماتے ہیں،

کفر کبھی براءت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے مثلاً آیت "اِنِّی کَفَرْتُ بِمَا اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ" یہاں پر کفرت "براءت کے معنی میں مستعمل ہے لیکن وہ کفر جو ان تمام سے کمتر درجہ کا ہے یہ ہے کہ انسان خدا کی وحدانیت اور نبوت کی صمیم قلب سے تصدیق بھی کرے اور زیادہ سے زیادہ اقرار بھی لیکن کبائر کے ارتکاب سے اپنے آپ کو نہ بچا سکے جیسے قتل، افساد فی الارض، اولوالامر کی مخالفت اور اجماع مسلمین کے خلاف عمل ونحو ذالک[۱]۔

یہاں پر ایک اور اہم نکتہ سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ شارعؑ نے لفظ "کفر" کا اطلاق ماسوا ان چار چیزوں کے اور پر بھی کیا ہے جیسے کفران حقوق، اور کفران نعمت وغیرہ الفاظ احادیث صحیحین میں موجود ہیں چنانچہ حضرت امام بخاریؒ اپنے قول "کفر دون کفر" سے یہی مراد لیتے ہیں یعنی ایک کفر دوسرے کفر سے نیچے اور کم درجہ پر ہے[۲]۔

تصریحات بالا سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شارع نے لفظ کفر کا اطلاق بہت سی چیزوں پر کیا ہے جس کو مختصر لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید کے کسی حکم اور کسی چیز کا انکار یا اس میں شک اور تردد کرنا کھلی ہوئی بغاوت اور نافرمانی ہے بعض عقائد کی تفصیل صحیح وثابت روایات میں بایں الفاظ موجود ہے:۔

---

[۱] فتح الملہم [۲] عینی۔

اَنْتَ الحق، وَ قولك الحق، وعدك الحق، ولقاء ك حق، والجنة حق، والنار حق، والسَّاعة حق[1]

بہرحال جو چیزیں یقینی طور پر دین میں سے ہیں ان میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی چیز کا انکار کرنا بھی حقیقی کفر ہے[2]

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن حکیم کبھی ایک ہی حقیقت کو مختلف اسلوب سے ادا کرتا ہے چنانچہ لفظ مال کو متعدد جگہ فضل، خیر، حسنہ، اور رحمۃ وغیرہ سے۔ اور اسی طرح ایمان کو صلوٰۃ، بر، تقویٰ، دین، دین اسلام، عمل، وغیرہ سے تعبیر کرتا ہے، کہیں مومنوں کے لئے صادق، محسن، متقی، اور کہیں عباد الرحمٰن، اولیاء اللہ، صدیق، اور شہید، مسلم، وغیرہ کی اصطلاحات اختیار کرتا ہے۔ اور یہ قرآن کریم کا عام اسلوب بیان ہے تصریحات ذیل ملاحظہ ہوں۔

ایمان کی اصلی بنیاد اور دین کی حقیقی اساس توحید ہے یعنے اکیلے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور معبود ماننا اور کسی کو اس کا شریک نہ سمجھنا سارا قرآن توحید اور دلائل توحید سے بھرا پڑا ہے اس لئے بخیال طوالت اس بحث کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھتا ہوں۔

عہد الست میں اکیلے اللہ کی ربوبیت کا اقرار اور قیامت کے دن کا عقیدہ موجود ہے یہی دونوں اصل دین ہیں پھر ہبوط کے وقت اولاد آدم کو ہدایت کی گئی۔

(۱) يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (اعراف آیت ۳۵)

اے بنی آدم اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیتیں سنائیں تو جو ڈر رکھے گا اور اپنے عمل کو ٹھیک کرے گا نہ وہ غمگین ہوں گے نہ خوف زدہ۔

آیت بالا میں رسالت اور کتاب کا عقیدہ ہے اور رسالت میں ملائکہ پر بھی ایمان لانا شامل ہے جو رسولوں تک

---

[1] موطا امام مالک [2] کلیات [3] حجۃ القرآن۔

وحی لے کر اترتے ہیں۔

مسلمان ہونے کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

(۱) وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (بقرہ آیت ۱۷۷)	بلکہ اصل نیکی تو ان کی ہے جو اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں۔
(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (النساء آیت ۱۳۶)	اے ایمان والو یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی ہے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی تھی پہلے۔
(۳) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۔ (بقرہ) آیت ۲۸۵۔	مان لیا رسول نے جو کچھ اترا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو۔
(۴) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔	مومن تو بس وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر انہوں نے شک نہ کیا اور اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے (مومن) ہیں۔
(۵) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ (حدید آیت ۱۹)	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔
(۶) وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (حم السجدہ آیت ۳۳)	اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو لوگوں کو خدا کی طرف بلائے اور نیکو کار بھی ہو اور کہے کہ میں بھی خدا کے فرمانبردار بندوں میں ہوں۔

(۷) قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ (انعام آیت ۱۶۲ و ۱۶۳)

کہو کہ میری نماز اور میری تمام عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور مجھ کو ایسا ہی حکم دیا گیا ہے اور میں اس کے فرمانبردار بندوں میں پہلا (فرمانبردار) ہوں۔

آیت بالا میں مومن اور مسلم کی جو صفت بیان کی گئی ہے جب تک اس کے ضمیر سے یہ صدا بلند نہ ہو وہ اس معزز خطاب کا ہرگز سزاوار نہیں ہے۔

اس کے بعد سورۂ فرقان کا آخری رکوع پڑھ جائیے عقائد و اخلاق کا پورا اور مکمل جلوہ نظر آئیگا۔

یہاں تک تو قرآنی تصریحات پیش کی جاچکیں اب احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان و اسلام کے استعمالات پیش کئے جاتے ہیں۔

امیر المومنین فی الحدیث حضرت امام بخاریؒ اپنی صحیح میں "باب امور الایمان" منعقد فرما کر کم و بیش (۴۰) ابواب کے ماتحت روایات سے استدلال فرماتے ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں چند ابواب کا خلاصہ درج ذیل ہے جس میں امام موصوف نے یہ ثابت فرمایا ہے کہ ایمان کا اطلاق شارع نے جن جن چیزوں پر کیا ہے وہ یہ ہیں:۔

کہیں ایمان کا اطلاق محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم و محبت انصار پر کیا گیا ہے کہیں حیا اور قیام لیلۃ القدر کو ایمان فرمایا ہے۔ کہیں جہاد، صلوٰۃ، اور زکوٰۃ و ادائے خمس کو ایمان سے موسوم کیا ہے۔ رمضان کے روزے اور نماز تراویح کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے کہیں یہ فرمایا ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے سو وہ مومن ہے کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ ایمان کا اصلی مزہ اسی نے چکھا جو اللہ کو اپنا رب اور اسلام کو اپنا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیغمبر اور نبی تسلیم کرنے پر راضی ہوا۔ یہ بھی فرمایا کہ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھوں سے مسلمان محفوظ رہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ مومن

وہی ہے جس سے لوگ اپنی آبروؤں، جانوں اور مالوں کی نسبت مامون و محفوظ ہیں۔

غرض صدہا احادیث و آثار موجود ہیں جن میں ایمان کا استعمال مختلف چیزوں پر کیا گیا ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے آیت لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ میں قول منافق کو ایمان سے موسوم کیا ہے۔

اس کے بعد اب ایک تفصیلی روایت پیش کر کے اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔

مشہور حدیث جبرئیل جو حضرت عمر بن الخطاب اور دیگر صحابہ سے صحیحین میں موجود ہے آیت "وَلٰكِنَّ الْبِرَّ" کی شرح و تفسیر کرتی ہے اس میں الفاظ ذیل بھی موجود ہیں۔

قال اخبرنی یا محمد عن الاسلام قال الاسلام ان تشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ وتقیم الصلوٰۃ وتوتی الزکوٰۃ وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیہ سبیلا قال صدقت فعجبنا لہ یسالہ ویصدقہ قال فاخبرنی عن الایمان قال ان تومن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخر وتومن بالقدر خیرہ وشرہ قال فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ صحیحین

(جبرئیل نے پوچھا بتائیے اسلام کیا چیز ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی وحدانیت اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی شہادت دے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے، رمضان کے روزے رکھے اور بشرط استطاعت بیت اللہ کا حج کرے۔ جبرئیل نے کہا سچ فرمایا (راوی کہتا ہے ہم تعجب کرتے تھے کہ خود ہی پوچھتا ہے خود ہی تصدیق کرتا جاتا ہے) پھر پوچھا ایمان کیا شئے ہے؟ آپ نے اسے جواب دیا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے انبیاء پر، قیامت پر اور تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لائے۔ پھر سوال کیا بتائیے احسان کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا احسان یہ ہے کہ تو خدا کی عبادت اس طور پر کرے گویا اسے دیکھ رہا ہے اگر یہ نہیں تو یہ کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

لہ مجمع القرآن۔

امام ابن تیمیہ نے فرمایا ہے کہ سلسلہ ایمانیات میں حق بات وہی ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث جبرئیل کی شرح میں بیان فرمایا ہے۔ دین وملت اور اس کے اہل کے تین مدارج ہیں:۔ اسلام، ایمان، اور اعلیٰ ترین احسان۔ پس جو شخص اس بلند رتبے تک پہنچ گیا وہ اس کے قریب اور مقابل درجوں پر بدرجہ اولیٰ پہنچا۔ لہٰذا محسن کو مومن اور مومن کو مسلم کہیں گے لیکن مسلم کو اصطلاحی طور پر مومن کہنا ضروری نہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن پاک نے بھی اسی طرح امت کے تین درجے قائم کئے ہیں ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (فاطر) "پھر ہم نے وارث کیے کتاب کے وہ لوگ جن کو چن لیا ہم نے اپنے بندوں میں سے پھر کوئی ان میں سے بُرا کرتا ہے اپنا اور کوئی ان میں بیچ کی چال پر ہے اور کوئی اُن میں آگے بڑھ گیا ہے لیکر خوبیاں اللہ کے حکم سے یہی ہے بڑی بزرگی"

حدیث جبرئیل کی ضروری تشریحات (۱) اسلام محض کلمۂ توحید ورسالت کا زبانی اقرار، نماز پنجگانہ، روزۂ رمضان، حج، زکوٰۃ پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتا ہے اس سے آدمی کفر صریح کی اُخروی و ذمیت کے مواخذات سے بچ جاتا ہے یعنی قضاء شرعی کی رو سے وہ کافروں کی فہرست میں شامل نہیں ہوسکتا بلکہ دائرۂ اسلام میں داخل سمجھا جاتا ہے۔

(۲) ایمان، عالم غیب وعالم روحانی کے ان متعلقہ امور کے دل سے یقین کرنے کا نام ہے جو عقل مادی سے سمجھ میں نہیں آسکتے مثلاً خدا کی ذات وصفات، فرشتوں کا وجود صحف انبیاء کا خدا کی طرف سے نزول پیغمبروں کا خدا کی جانب سے ارسال اور ان پر خدا کی وحی کا نزول، قیامت کے دن کا یقین اور تقدیر کا اقرار۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ اسلام قضاء شرعی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے جس کا ضد اس سے علانیہ سرکشی ومخالفت کرنا ہے اور "ایمان" خدا کے آگے اپنے دل سے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے جس کی وجہ سے عالم بالا کی ہر متصرفانہ حرکت کا دل سے یقین کرنا اور اس کے تصرفات کو اپنے اوپر مسلط سمجھنا پڑتا ہے جس کا

ؔ کتاب الایمان

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ وہ قضاء شرعی کی دسترس سے محفوظ بھی ہو جائے تو بھی عالم بالا کی گرفت سے اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ اسی بیم و رجاء کی حالت کو "الایمان بین الرجاء و الخوف من اللہ تعالیٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) احسان جب ایمان یعنی تصدیق قلبی عالم بالا اور اس کے حرکات و سکنات و تصرفات کی واقعی غالب ہو گئی تو اب اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل کے اثرات اعضاء و جوارح اور اعمال و اقوال پر پڑنے لگتے ہیں کیونکہ ہر عمل میں خدا کے ساتھ اخلاص نیت، و حضور قلب حاصل ہو جاتا ہے جو چیز غائب تھی وہ حاضر ہو جاتی ہے اور جو پس پردہ تھی وہ عیاں ہو جاتی ہے۔ عربی میں احسان کے معنی کسی چیز کو بہترین و کامل طور پر کرنے کے ہیں مثلاً کہتے ہیں "وھو یحسن الکتابتہ" یعنی وہ نہایت عمدہ لکھتا ہے۔ یہی وہ اصطلاح ہے جو آیات قرآنی اور احادیث میں اکثر استعمال کی گئی ہے۔

تنبیہ ایمان و اسلام اگرچہ باعتبار مفہوم و حقیقت شرعی ایک دوسرے کے مغائر ہیں لیکن وجود اور تحقیق کے لحاظ سے جو شریعت میں معتبر ہے وہ ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں جس طرح حقیقی اسلام بدون ایمان نہیں پایا جا سکتا ٹھیک اسی طرح ایمان بھی جو نام ہے دل سے مائل ہونے اور اپنے متعلقات مخصوصہ کے ساتھ تصدیق کرنے کا اس کے بدون ایمان پایا نہیں جا سکتا کیونکہ شریعت میں معتبر و ممدوح وہی تصدیق ہے جو اعمال صالحہ کے ساتھ پائی جائے اس لیے تصدیق بے عمل اور عمل بے تصدیق کسی طرح معتبر نہیں یہی نکتہ ہے جس کو اہل علم بولا کرتے ہیں الایمان و الاسلام واحد[۱]

ایک اہم تصدیق | حجۃ اللہ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ نے حجۃ اللہ البالغہ و بدور البازغہ و تفہیمات الٰہیہ میں آیات و احادیث ایمان پر ایک نہایت لطیف بحث فرمائی ہے۔ آپ کے مفہوم کو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک وہ جن پر احکام دنیا کی بنا ہے

---

[۱] از افادت استاذی مولانا ماجد علی ؒ شاگرد رشید حضرت قطب گنگوہی ؒ۔ (نجم الدین)۔

یعنی جان و مال کا بچاؤ یہ ایمان انقیاد ظاہری سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا بھی مطلب ہے کہ مجھ کو حکم ہے جہاد کا تا آنکہ لوگ توحید و رسالت کی شہادت دیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اگر لوگوں نے ایسا کیا تو مجھ سے اپنی جان و مال کو سوائے حقوق اسلامی (قصاص وغیرہ) کے بچا لیا اور حساب ان کا اللہ کے ذمہ ہے۔

دوسری قسم ایمان کی وہ ہے جس پر احکام آخرت یعنی نجات و درجات پانے کی بنا ہے اور وہ شامل ہے ہر اعتقاد حق اور عمل پسندیدہ کو اور ملکۂ فاضلہ کو جو کم و بیش ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب امور کا نام ایمان رکھا تاکہ تنبیہ ہو اس پر کہ یہ سب باتیں جزو ایمان ہیں اور ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں۔ ایمان کی مثال درخت کی ہے کہ تنہ، شاخ، پتے، پھول، پھل کے مجموعہ کو درخت کہا جاتا ہے۔ اگر شاخیں کاٹ لی جائیں اور پتیاں جھاڑ دی جائیں اور پھل توڑ لیے جائیں تو درخت ناقص کہلائے گا اور اگر تنہ اکھاڑ دیا جائے تو اصل نہ رہے گی[1]

اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

ایمان دو معنوں میں اور آتا ہے۔

(۱) دل سے یقین کرنا اسی معنی میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا حضرت جبرئیل کے جواب میں ان تومن باللہ وملائکتہ یعنی یقین کرو اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر۔

(۲) قلبی اطمینان اور تسکین اور وہ دلی حالت جو مقربین بارگاہ کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی معنی میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہ وضو نصف ایمان ہے اور زنا کرنے سے ایمان بالکل جاتا رہتا ہے[2]

اہل لغت بھی مذکورہ بالا بیانات کی تائید کرتے ہیں۔ امام لغت جار اللہ زمخشری فرماتے ہیں:۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ [2] حجۃ اللہ البالغہ۔

الایمان افعال من الامن یقال امنتہ وامنتہ غیری ثم یقال امنہ اذا صدقہ وحقیقتہ امنہ التکذیب و المخالفۃ وامانتہ بالباءِ فلتضمینہ معنی اقر و اعترف و تعدیتہ باللام کما فی قولہٖ تعالٰی انومن لک واتبعک الارذلون فلتضمینہ معنی الاذعان و الانقیاد)[1]

ایمان امن سے مشتق ہے اور یہ لفظ کبھی متعدی بیک مفعول اور کبھی بدو مفعول ہوتا ہے جیسے "آمنتہ و امنتہ غیری" پھر رفتہ رفتہ ایمان تصدیق کے موقع پر استعمال ہونے لگا "آمنہ" کے حقیقی معنے کسی کو تکذیب اور مخالفت سے مامون کرنے کے ہیں لیکن جب اس کا صلہ (ب) سے آئے تو اقرار اور اعتراف کرنے کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں (اور جب اس کا صلہ لام سے آئے مثلاً انومن لک الخ تو اذعان و انقیاد کا مفہوم ہوتا ہے۔

علامہ آلوسیؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

ایمان کے لغوی معنی تصدیق کے ہیں یعنی مخبر کی بات کا یقین کرنا اور اسے سچا جاننا اور یہ امن سے مشتق ہے لیکن ایمان کے شرعی معنی ہر اس چیز کی تصدیق کرنے کے ہیں جس کی بات یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ نبی کا فرمان ہے اگر وہ بات بتفصیل معلوم ہے تو ایمان تفصیلی ضروری ہے اور اگر مجمل معلوم ہے تو ایمان اجمالی کافی ہے اور یہی مذہب جمہور محققین کا ہے"[2]

ایک اور اہم تحقیق حضرت الاستاذ امام فراہیؒ نے تفسیر نظام القرآن میں ایمان پر اپنے حسب عادت ایک نادر بحث فرمائی ہے کفران نعمت ہوگا اگر ہم اس موقع پر آپ کی تحقیق کو نظر انداز کردیں لہٰذا اس بحث کو مکمل کرنے کے لیے آپ ہی کے بیان پر ہم اس گفتگو کو ختم کریں گے۔ فرماتے ہیں:۔

"ایمان امن سے مشتق ہے از روے لغت لفظ ایمان چند معانی میں مستعمل ہے۔ (۱) "آمنہ" یعنی اس نے اسے امن بخشا قرآن مجید میں ہے وآمنھم من خوف"(۲) "امن لہ" یعنی اس نے اس کی

[1] فتح الملہم۔ [2] ایضاً۔

تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا۔ (۳) "امن بہ" یعنی اس پر یقین کامل کیا۔

قرآن نے لفظ ایمان کو ان میں سے ہر ایک معنی میں استعمال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک مومن بھی ہے کیونکہ وہ پناہ مانگنے والوں کے لیے امن و سلامتی کا گہوارہ ہے۔ یہ تو لغوی حیثیت سے لفظ زیر بحث کی شرح و تفسیر تھی لیکن السنہ قدیمہ کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے چنانچہ عبرانی زبان میں لفظ אמן (امن) صدق اور اعتماد کے معنی میں مستعمل ہے جس کا متعدی ایمان، تصدیق اور حیثیت ہوا کلمۂ تصدیق (האמין) (آمین) اسی سے مشتق ہے پس لفظ ایمان تعبیر ہے ایسے ایقان صحیح کی جس کے اندر اس کے تمام لوازم یعنی خشیۃ الٰہی، توکل علی اللہ، اور اذعان کامل بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ اس آئینۂ حقیقت نما میں مومن کا عکس دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مومن وہ شخص ہے جو خدا پر، اس کی کارسازیوں پر اور اس کی آیتوں پر صدق دل سے ایمان لے آئے، اس کے احکام کے سامنے پورے خلوص کے ساتھ گردن جھکا دے، اپنے تمام معاملات کی زمام اسی کے ہاتھوں میں دے دے اور رضا و تسلیم کا مجسمہ بن کر اس احکم الحاکمین کے ہر فیصلہ کا خیر مقدم کرے پس جس طرح ایمان عقل کے لیے نور اور ہدایت ہے اسی طرح قلب کے لیے سراپا سلامتی اور طہارت ہے یعنی اس کا فیضان رائی اور ارادہ دونوں پر ہوتا ہے اور اس کی وسعت علم و عمل دونوں کو اپنے دامنوں میں سمیٹے ہوئے ہے اب غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قرآن کی اصطلاح میں مومن وہ بندہ ہے جو اللہ وحدہ لاشریک کا سچا پرستار ہو، اور جس کی عبودیت کا جوہر ایقان کامل اور اذعان خالص دونوں کے جلووں سے معمور ہو[1]

ان تصریحات کے بعد ہم پر فرض ہے کہ قرآن حکیم کے پیش کردہ اصول پر اشخاص و رجال کو تولیں اور اسی کے مطابق کفر و ایمان کے معزز و غیر معزز خطابات ایک دوسرے پر استعمال کریں تاکہ کفر اور ایمان مسلم اور کافر اپنی اپنی جگہ نظر آئیں اور حدود الٰہیہ سے کوئی تجاوز نہ ہو ساتھ ہی آیات ذیل پر غور کیا

[1] سورۃ العصر ص ۱

جائے جس میں ایک مومن و مسلم کے صحیح خط و خال کو خداوند قدوس نے پوری وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (انفال آیت ۲ و ۳)	مومن تو بس وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو بڑھاتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرتے ہیں یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں ان کے لیے درجے ہیں اپنے رب کے پاس اور مغفرت اور بہترین روزی۔

اس کے بعد سورۂ بقرہ کا ابتدائی رکوع اور سورۂ حج کی آخری آیت، نیز سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات اور سورۂ فرقان کا آخری رکوع اور حجرات کی ۱۰-۱۲ آیات تک بار بار پڑھیے تاکہ میرے مذکورہ بیانات کی تصدیق آپ کو قرآن ہی سے ہو جائے۔ اور یہ صاف ہو جائے کہ کفر و اسلام دو متقابل چیزیں ہیں اس لیے یہ کہنا پڑیگا کہ اسلام میں جو چیز معتبر ہے اسی کا نہ ہونا کفر ہے ایمان رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا یقین ہے اور یہی اسلام بھی کہلاتا ہے۔ اس تصدیق کا نہ ہونا کفر ہے۔ یہی چیز ہے جو کتب عقائد و کلام میں بالاتفاق موجود ہے اور جس کو شیخ ابن ہمام بھی بیان فرماتے ہیں کہ:

> "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے جو احکام بیان فرمائے ان تمام کی تصدیق ایمان ہے یہ احکام خواہ اعتقادی ہوں یا عملی[1]۔"

حتیٰ کہ علامہ ابن عابدین جامع الفصولین کے حوالہ سے شامی میں امام طحاوی سے یہ نقل کرتے ہیں کہ:۔

[1] مسامرہ۔

"ہمارے اصحاب کے نزدیک ایمان سے اس وقت خارج ہوگا جب کہ اس کا انکار کرے جس کی تسلیم سے مسلمان ہوا تھا اور جب تک کہ یہ انکار یقینی نہ معلوم ہو کفر کا حکم نہ دیا جائے گا۔"[1]

خلاصہ یہ کہ محض زبان سے اقرار کرنا یہ تو اسلام کا ادنیٰ درجہ ہے لیکن بلند ترین یہ ہے کہ زبانی اعتراف کے ساتھ ساتھ قلبی اذعان و اعتقاد بھی ہو، ٹھیک اسی کے مطابق اعمال سرزد ہوں اور انسان قضا و قدر کے سامنے تسلیم و رضا کا پیکر بن جائے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "یہی مومن و مسلم کی سچی تعریف اور صحیح تصویر ہے"[2]

[1] شامی۔ [2] مفردات۔

سد باب ذریعہ

اصول تشریع میں سے ایک اصل عظیم

از افادات علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ

(علامہ ابن القیم کی کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین فقہ اسلامی کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس میں علامۂ موصوف نے اسلامی قانون کے مآخذ اور اسکی روح اور اسکے اسرار و حکم اور طرق قیاس و استنباط اور اصول فتویٰ پر اس خوبی سے بحث کی ہے کہ اس کی نظیر علماء اسلام کی تصنیفات میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس اشاعت میں ہم اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ درج کر رہے ہیں جس میں شریعت کے اصول میں سے ایک اصل عظیم کی تشریح کی گئی ہے۔ اگر موقع ملا تو علامہ کے بعض اور مقالات بھی ان صفحات میں نقل کیے جائیں گے۔ ایڈیٹر)

انسان جب کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس کے مناسب اسباب و وسائل اختیار کرتا ہے اور مقصد تک پہنچنا اسباب ہی کے ذریعہ سے ممکن ہوتا ہے۔ پس تشریعی نقطۂ نظر سے جو حیثیت مقصد کی ہوگی وہی اس تک لے جانے والے ذرائع کی ہوگی، یعنی جو مقصد حرام اور گناہ ہے اس کے اسباب اسی درجہ میں مکروہ اور ممنوع ہوں گے جس درجہ میں وہ اس مقصد تک پہنچانے کے لیے مدد و معاون ہوں اور جو مقصد طاعات و قربات کے قبیل سے ہو اس کے اسباب اسی درجہ میں محمود اور پسندیدہ ہوں گے جس درجہ میں وہ مقصد تک پہنچانے کے لیے مددگار اور مفید ہوں۔ حاصل یہ کہ وسیلہ مقصود خود مقصود کے تابع ہوتا ہے۔ اگرچہ مقصد دونوں ہیں، مگر ایک قصد غایات کا مقصود ہے اور دوسرا قصد وسائل کا مقصود۔ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو

حرام قرار دیتا ہے تو اس تک پہونچانے والے جتنے طریقے اور وسائل ہوتے ہیں ان کو بھی وہ ممنوع کر دیتا ہے تاکہ اس شئے حرام کی تحریم مضبوط اور مستحکم ہو جائے اور لوگ اس کے پاس تک نہ پھٹک سکیں۔ کیونکہ اگر اس کے وسائل و ذرائع کو مباح کر دیا جاتا تو اس سے تحریم کا مقصد ہی باطل ہو جاتا اور لوگ مخمصہ میں مبتلا ہو جاتے۔ اللہ کی حکمت اور اس کے علم سے ایسی کھلی ہوئی فروگذاشت بعید بلکہ ابعد ہے۔ اللہ تعالیٰ تو خیر احکم الحاکمین ہے، اس نادانی کو تو دنیوی پادشاہوں کی سیاست بھی قبول نہیں کرتی۔ بادشاہ جب کسی چیز کو جرم قرار دیتے ہیں تو اس جرم کے ارتکاب میں مدد دینے والے آلات و وسائل کو بھی ممنوع کر دیتے ہیں کیونکہ اگر اس کو مباح رہنے دیا جائے تو خلاف ورزی قانون کے امکانات بڑھ جائیں اور قانون سازی کا مقصود ہی فوت ہو جائے۔ اسی طرح اطبا جب بیماری کا علاج کرتے ہیں تو بیمار کو ان تمام چیزوں سے روک دیتے ہیں جو بیماری کو پیدا کرنے اور بڑھانے کی باعث ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو اصلاح بدن کا مقصود ہی پورا نہ ہو۔ جب حال یہ ہے تو اس شریعت کاملہ کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جو مصلحت اور کمال کے بلند ترین مدارج پر پہنچی ہوئی ہے؟ جو شخص اس شریعت کے قواعد اور احکام پر غور کرے گا اس کو معلوم ہوگا کہ اللہ اور اس کے رسول نے تمام محرمات کا سد باب کرنے کے لیے ان ذرائع پر پابندیاں عائد کر دی ہیں جو ان محرمات تک لے جانے والے ہیں۔

کسی مفسدہ تک لے جانے والا فعل یا قول دو قسموں میں سے کسی ایک قسم کا ہوتا ہے:

ایک وہ جو خصوصیت کے ساتھ اسی مفسدہ کے لئے موضوع ہو۔ جیسے شراب کہ وہ نشہ پیدا کرنے ہی کے لیے بنائی جاتی ہے۔ یا جیسے قذف کہ وہ کسی کو بدنام کرنے ہی کے لیے کیا جاتا ہے۔ اور زنا کہ اس کا لازمی نتیجہ اختلاط انساب و فساد فراش ہے۔ یہ ایسے افعال یا اقوال ہیں جن کا کوئی دوسرا پہلو ان مفاسد کے سوا نہیں ہے۔

دوسرا وہ جو موضوع تو کسی جائز یا مستحب امر کے لیے ہے، مگر اس کو کسی حرام چیز کے لیے یا تو بالقصد

وسیلہ بنالیا جاتا ہے، یا وہ بلاقصد وارادہ اس کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ بالقصد بنائے جانے کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص نکاح کرے اور اس کا مقصد کسی مطلقہ مغلظہ عورت کو اس کے پہلے شوہر کے لیے حلال کرنا ہو، یا کوئی شخص بیع کا معاملہ کرے اور اس کا مقصد سود سے نفع اٹھانا ہو، یا کوئی شخص اپنی بیوی سے خلع کا معاہدہ کرے اور اس کا مقصد قسم توڑنا ہو۔ اور بلاقصد وارادہ اس کے ذریعۂ فساد بن جانے کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص تطوع کی نیت سے اوقات ممنوعہ میں نماز پڑھے، یا مشرکین کے سامنے ان کے بزرگوں اور معبودوں کو گالی دے یا قبر کے سامنے خدا کی عبادت کرے۔

دوسری قسم کے ذرائع کی پھر دو قسمیں ہیں:۔

ایک یہ کہ اس قول یا فعل کی مصلحت اس کے مفسدہ کے مقابلہ میں لائق ترجیح ہو۔

دوسری یہ کہ اس کا مفسدہ اس کی مصلحت سے بڑھا ہوا ہو۔

پس تمام ذرائع کل چار اقسام کے ہوئے:۔

(۱) وہ ذریعہ جو مفسدہ ہی کی طرف لے جانے کے لیے خاص ہو۔

(۲) وہ ذریعہ جو امر مباح کے لیے وضع کیا گیا ہو مگر اس کو کسی گناہ کے لیے بالقصد ذریعہ بنا لیا جائے اور اس کا فساد اس کی مصلحت پر غالب ہو۔

(۳) وہ ذریعہ جو کسی جائز مقصد کے لیے اختیار کیا جائے مگر بلاارادہ وہ انسان کو کسی مفسدہ میں مبتلا کر دے۔

(۴) وہ ذریعہ جو امر مباح کے لیے مقرر ہو۔ اور اس میں مفسدہ کا خطرہ بھی ہو، مگر اس کی مصلحت اس کے مفسدہ پر مرجح ہو۔

پہلی اور دوسری قسم کی مثالیں اوپر بیان کی جاچکی ہیں۔ تیسری قسم کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص اوقات ممنوعہ میں نماز پڑھے یا مشرکین کے معبودوں کو ان کے سامنے گالی دے، یا کوئی بیوہ عورت

زمانۂ عدت میں بناؤ سنگھار کرے۔ چوتھی قسم کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی اجنبی عورت کو اس ضرورت سے دیکھے کہ وہ اُسے نکاح کا پیغام دینا چاہتا ہے، یا اس سے کوئی معاملہ کر رہا ہے، یا وہ قاضی ہے اور عورت اس کے سامنے گواہ یا فریق معاملہ کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے۔ یا ممنوعہ اوقات میں کسی مجبوری سے کوئی فعل کرے، یا کسی ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہے۔ شریعت نے اس آخری قسم کے افعال کو ان کی مصلحتوں کے درجات کے لحاظ سے مباح یا مستحب یا واجب ٹھیرایا ہے۔ اور پہلی قسم کے ذرائع کو اسی درجہ میں مکروہ یا حرام قرار دیا ہے جس درجہ کے مفسدہ تک وہ لے جانے والے ہیں۔ اب رہ گئے بیچ کی دو قسموں کے ذرائع تو زیادہ تر انہی کے باب میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا شریعت ان کو مباح ٹھیراتی ہے یا ممنوع؟ میں کہتا ہوں کہ اس امر کی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ شارع نے ان دونوں قسم کے ذرائع کو بھی روکا ہے۔ چنانچہ ذیل میں اس کی چند نظیریں پیش کی جاتی ہیں:-

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ "جن معبودوں کو یہ لوگ اللہ کے بجائے پکارتے ہیں ان کو گالیاں نہ دو کہ یہ دشمنی سے بے سمجھے بوجھے خدا کو گالیاں دیں گے"۔ دیکھیے! معبودان باطل کو برا کہنا ظاہر ہے کہ خدا پرستانہ حمیت اور شرک سے نفرت ہی کی بنا پر ہوگا، اور یہ مقصود بُرا نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کر دیا، کیوں کہ یہ اللہ کی شان میں گستاخی کا سبب بن جاتا ہے، اور معبودان باطل کی اہانت میں خواہ کوئی بھی مصلحت ہو، بہرحال وہ اس مفسدہ کے مقابلہ میں کم ہے جو اس سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس بات پر نہایت صریح دلیل ہے کہ اگر کسی فعل جائز سے کوئی مفسدہ پیدا ہوتا ہو اور وہ اس کی مصلحت کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہو تو اس کو ممنوع قرار دینا درست ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ "عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مارتی نہ چلیں کہ اُس زینت کا اظہار ہو جو انہوں نے چھپا رکھی ہے"۔ زمین پر پاؤں مارنا

فی نفسہ کوئی گناہ نہیں۔ مگر اس کو اس لیے ممنوع ٹھیرایا گیا کہ پازیب وغیرہ کی جھنکار سننے والوں کے جذباتِ شہوانی میں حرکت اور عورتوں کی طرف توجہ کا سبب نہ بن جائے۔

(۳) حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ الآیہ۔ "اے اہلِ ایمان تمہارے غلام اور وہ لڑکے جو ابھی بالغ نہیں ہوئے ہیں تین وقتوں میں جب تمہارے پاس آنا چاہیں تو پہلے اجازت مانگ لیا کریں ایک صبح کی نماز سے پہلے۔ دوسرے دوپہر کو جب تم کپڑے اتار دیا کرتے ہو۔ تیسرے نمازِ عشا کے بعد" اس آیت میں اصل مقصود تو یہی ہے کہ ہوشیار بچے اور غلام اچانک داخل ہو کر لوگوں کو کسی نادیدنی حالت میں نہ دیکھیں، کیونکہ اس سے مفاسد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے لیکن اس کے لیے وہ تین اوقات مخصوص کر دیے گئے جن میں مفسدہ کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ باقی رہے دوسرے اوقات تو گو مفسدہ کے امکانات ان میں بھی ہیں لیکن چونکہ وہ بہت قلیل ہیں اس لیے ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔

(۴) ارشاد باری ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا۔ "اے مسلمانو! نبی کو پکارتے وقت رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو۔" اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ کہنے سے مسلمانوں کو کیوں منع فرمایا؟ مسلمان جب رَاعِنَا کہتے تھے تو ان کی نیت اچھے ہی معنی کی ہوتی تھی لہٰذا یہ ان کے لیے جائز ہونا چاہیے تھا۔ مگر حق تعالیٰ نے ان کو اس لیے روک دیا کہ وہ اس قول میں بلا قصد و ارادہ یہودیوں کے ہم زبان نہ بن جائیں جو اس لفظ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے لیے استعمال کرتے

۱؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب تقریر فرماتے اور دورانِ کلام میں کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ رَاعِنَا کہا کرتا تھا، یعنی ہم پر عنایت ہو، ہم نہیں سمجھے لیکن یہ ذو معنی لفظ تھا۔ یہودی بھی ایسے مواقع پر قصداً یہی لفظ بولتے تھے اور ان کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ "اے احمق شیخی خورے" (نعوذ باللہ) اور کبھی وہ زیادہ بدتمیزی سے کام لیکر زراعین کے کسرے کو کھینچ دیتے تھے جس سے رَاعِیْنَا بن جاتا تھا یعنی "اے ہمارے گڈریے"

تھے، اور اس لیے بھی کہ اگر مسلمانوں میں یہ محاورہ رائج ہو گیا تو یہودیوں کو سب نبی کے لیے ایک پردہ مل جائے گا اور وہ اس کے عام استعمال کو آڑ بنا کر نبی کو گالی دیتے رہیں گے۔

(۵) اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى "تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے، مگر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا خدا کا خوف کھائے"
دیکھیے! ایک بدترین دشمن خدا اور کٹے کافر اور شدید سرکش سے نرمی کے ساتھ کلام کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ کیوں؟ باوجودیکہ وہ سخت سے سخت زجر و توبیخ اور ملامت کا مستوجب تھا۔ مگر اس لیے نرمی کی تاکید کی گئی کہ کہیں غلظت اور شدت اس کی تنفیر کا سبب نہ بن جائے اور اتمام حجت میں خلل نہ واقع ہو۔ اس کے حق میں سختی کلام جائز تھی۔ مگر اس جائز کو اس لیے ممنوع کیا گیا کہ اس کا مفسدہ اس کی مصلحت سے زیادہ وزنی تھا۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے مکۂ معظمہ میں مسلمانوں کو مشرکین کے خلاف طاقت استعمال کرنے سے روکا اور درگذر کا حکم دیا۔ اگرچہ مشرکوں سے لڑنا غیر جائز نہ تھا۔ مگر منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ ان کی جان اور ان کے دین اور اولاد کو ہلاکت سے بچانے کی مصلحت انتصار اور مقابلہ کی مصلحت کے مقابلہ میں راجح تھی۔

(۷) اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی اذان کے وقت خرید و فروخت سے منع فرما دیا۔ تجارت ایک جائز فعل ہے مگر منع اس لیے کیا گیا کہ یہ نماز جمعہ چھوٹ جانے کا ذریعہ نہ بن جائے، یا اس کو ترک نماز کے لیے بہانہ بنا لیا جائے

(۸) متفق علیہ حدیث ہے، جناب حمید بن عبد الرحمٰن حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا من الکبائر شتم الرجل والدیہ "کسی شخص کا اپنے باپ کو گالی دینا بڑے گناہوں میں سے ہے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا کوئی اپنے باپ کو بھی گالی دے گا؟ فرمایا ہاں یسب ابا الرجل فیسب اباہ ویسب امہ فیسب امہ۔" وہ دوسرے کے ماں باپ کو گالی دے گا تو

دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دیگا۔ بخاری میں اس کے الفاظ یہ ہیں اِن من اکبر الکبائر ان یلعن الرجل والدیہ قیل یا رسول اللہ کیف یلعن الرجل والدیہ قال یسب ابا الرجل فیسب اباہ ویسب امہ فیسب امہ۔ دیکھیے! وہ شخص جو کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے، خود اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا قرار دیا گیا۔ گو اس کا مقصد اپنے ماں باپ کو گالی دینا نہیں ہے، مگر جب اس نے گالی کے سبب کو حرکت دی اور اس کے وسیلہ کو کھٹکھٹا دیا، تو گویا وہ خود ہی اپنے ماں باپ کا شاتم اور لاعن بن گیا۔

(۹) نبی صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کو قتل کرنے سے باز رہتے تھے۔ گو ان کو قتل کرنے میں مصلحت بھی تھی لیکن اس مصلحت کے مقابلہ میں یہ مفسدہ زیادہ عظیم تھا کہ اس سے لوگوں میں بددلی پھیلے گی اور وہ کہیں گے کہ محمدؐ تو خود اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ حضور کو اندیشہ ہوا کہ یہ خیالات اگر پھیل گئے تو لوگ اسلام میں داخل ہونے سے رک جائیں گے اور جو نئے نئے داخل ہوئے ہیں وہ کھٹک جائیں گے۔ پس آپ کے نزدیک ترک قتل کے مفسدہ سے تنفیر قلوب کا مفسدہ عظیم تر تھا، اور مصلحت قتل کے مقابلہ میں مصلحتِ تالیف قلوب زیادہ وزنی تھی اس لیے آپ نے ایک جائز اور ایک حد تک ضروری فعل کو ترک فرما دیا۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام کیا کیونکہ اس میں بہت سے مفاسد ہیں جو زوال عقل پر مترتب ہوتے ہیں۔ پھر جب شراب کو حرام کر دیا گیا تو اس کا ایک قطرہ پینے کو بھی حرام کر دیا گیا، اسے گھر میں رکھنے سے بھی منع کر دیا گیا تاکہ ایک قطرہ کا پینا اس کو دوبارہ کثیر مقدار میں شراب کی طرف لے جانے کا سبب نہ بنے جو دل میں شراب کی طرف سے پیدا ہو چکی ہے اور اس کو اپنے پاس کسی جائز مقصد مثلاً تخلیل (سرکہ بنانے) کے لیے رکھنا ایک ناجائز فعل یعنی شُرب اور بیع کا ذریعہ نہ بن جائے۔ پھر سد باب ذریعہ میں اور زیادہ مبالغہ کیا گیا۔ شراب کے مرکبات کو ممنوع کیا گیا۔ عصیر پر اگر تین دن گذر جائیں تو اس کے استعمال کو بھی حرام کر دیا گیا۔ ایسے برتنوں میں نبیذ بنانے سے بھی روک دیا گیا جن میں شراب بنائی جاتی ہو یا جن میں نبیذ کے شراب بن جانے کا خدشہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قدر قلیل کی حرمت بیان کرنے کے ساتھ اس کی مصلحت بھی بیان فرما دی کہ اگر میں اس کی اجازت دے دوں تو سکر کی حد تک پینے کا دروازہ کھل جائے گا۔

(۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے سے منع کر دیا اگرچہ وہ قرآن پڑھانے ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ اور اجنبیہ کے ساتھ سفر کرنے کو بھی منع فرمایا خواہ وہ حج کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی سد باب ذریعہ کے قبیل سے ہے۔

(۱۲) اللہ تعالیٰ نے اجنبی عورتوں کی دید سے باز رہنے کا حکم دیا، اگرچہ دیکھنے والے کا مقصود محض اللہ کی صنعت کے محاسن دیکھنا اور خدا کی کاریگری میں تفکّر کرنا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی اس لیے ہے کہ اس قسم کی دیدہ بازی کہیں با قصد یا بلاقصد ایک ناجائز فعل کا ارادہ اور خواہش پیدا کرنے کا سبب نہ بن جائے۔

(۱۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر مسجدیں بنانے سے منع فرمایا اور ایسا کرنے والے پر لعنت کی اور قبروں کو پختہ بنانے اور بلند کرنے سے روکا اور ان کے سامنے یا ان کے قریب نماز پڑھنے کی مخالفت فرمائی۔ اور ان پر چراغ جلانا یا میلے کرنا یا شدّ رحال کرکے ان کی طرف جانا بھی ناجائز قرار دیا اور قبروں کو زمین کے برابر کرنے کا حکم دیا۔ یہ سب اس لیے تھا کہ پچھلی امتوں اور جاہل قوموں کی طرح مسلمان بھی کہیں رفتہ رفتہ ان کو بت نہ بنالیں اور شرک نہ کرنے لگیں۔ یہ سب افعال جس طرح ان کے لیے حرام ہیں جو شرک اور بت پرستی کا قصد کریں، اسی طرح ان کے لیے بھی حرام ہیں جن کے دل میں ایسا کرنے کا خطرہ تک نہ ہو، کیونکہ شارع کا مقصود تو حرام تک لے جانے والے ذریعہ کا سدباب ہے۔

(۱۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آفتاب نکلنے اور اس کے غروب ہونے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا اس لیے کہ یہ آفتاب پرستوں کے ہاں سجدہ کے اوقات تھے ظاہر ہے کہ مسلمان اگر ان اوقات میں نماز پڑھے گا تو اس کا مقصد خدا ہی کو سجدہ کرنا ہوگا، لیکن اس میں مشرکین کے ساتھ جو مشابہت ہے اس سے شارع کو خدشہ ہوا کہ یہ ظاہری مشابہت آگے چل کر مشارکت کا ذریعہ نہ بن جائے۔ غور کیجیے کہ جب اتنے بعید ذریعہ کا بھی دروازہ بند کیا گیا تو جو ذرائع اس کی بہ نسبت قریب تر ہیں ان کا دروازہ کیسے کھلا چھوڑ دیا جائے۔

(۱۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں اہل کتاب سے تشبّہ کرنے کو منع فرمایا ہے۔ مثلاً فرمایا کہ

یہود اور نصاریٰ اپنی ڈاڑھیاں نہیں رنگتے، تم ان کے خلاف کرو۔ یہودی جوتیاں پہن کر نماز نہیں پڑھتے تم ان کے خلاف کرو۔ یہودی صرف عاشورا کے دن روزہ رکھتے ہیں تم ان کے خلاف کرو۔ ایک دن اس سے پہلے اور ایک دن اس کے بعد بھی روزہ رکھو۔ نیز فرمایا کہ عجمیوں سے تشبہ نہ کرو۔ اور ترمذی کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، جس نے ہمارے سوا کسی غیر قوم سے مشابہت کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور امام احمد ابن حنبل کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا "جس نے کسی قوم سے تشبہ کیا وہ اسی قوم سے ہے" اس میں راز یہ ہے کہ ظاہری طریقوں میں مشابہت رفتہ رفتہ قصد اور عمل میں موافقت کا سبب بن جاتی ہے۔

(۱۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی اور بھتیجی، اور خالہ اور بھانجی کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنے سے منع فرما دیا اور فرمایا کہ "اگر ایسا کروگے تو قطع رحمی کروگے۔" اس فعل کی ممانعت میں اتنا مبالغہ کیا گیا کہ اگر عورت اس پر راضی بھی ہو تب بھی ایسا کرنا جائز نہیں۔ وجہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادی ہے کہ یہ اس قطع رحمی کا ذریعہ بن جائے گا جس کو خدا نے حرام کیا ہے۔

(۱۷) چار بیویوں سے زیادہ کرنے کو حرام کر دیا گیا کیونکہ یہ جور و ظلم کا ذریعہ نہ بن جائے۔ بعض لوگوں نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس سے انسان پر مصارف کا اتنا بار پڑ جائے گا جو اکل حرام کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ بہرصورت یہ بھی سد باب ذرائع کے قبیل سے ہے۔ اور چار بیویوں کو مباح کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی جور کا خدشہ ہے لیکن اس کی اباحت میں جو مصلحتیں ہیں وہ خدشۂ جور کے مفسدہ پر غالب ہیں۔

(۱۸) اللہ تعالیٰ نے زمانۂ عدت میں عورت کو صریحاً نکاح کا پیغام دینے سے منع فرما دیا، حتیٰ کہ عدتِ وفات میں بھی ایسی اجازت نہ دی، کیونکہ اگر ایسا کرنے سے نہ روکا جاتا تو خطرہ تھا کہ کوئی اچھا پیغام آنے کی صورت میں عورت جلدی نہ کر بیٹھے اور قبل از وقت عدت پوری ہو جانے کا یقین دلا کر نکاح نہ کرلے۔

(۱۹) اللہ تعالیٰ نے زمانۂ عدت میں اور حالت احرام میں عقد نکاح کو حرام کر دیا، خواہ یہ قرارداد کرلی گئی ہو کہ وطی، عدت گذرنے یا احرام اترنے کے بعد ہوگی۔ یہ اس لیے کہ عقد ہو جانا کہیں وطی کا ذریعہ نہ بن جائے

بخلاف اس کے روزے کی حالت میں عقد کرنے سے نہیں روکا اگرچہ خطرہ اس میں بھی تھا مگر بہت بعید تھا کیونکہ افطار کے وقت تک دن کے چند گھنٹے گذارنا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے کہ انسان بے صبر ہو جائے۔

(۲۰) شارع نے احرام کی حالت میں عطر لگانے سے منع کر دیا، کیونکہ خوشبو دواعی شہوت میں سے ہے۔ پس اس کی تحریم بھی سد باب ذریعہ کے قبیل سے ہے۔

(۲۱) شارع نے نکاح کے لیے دوسرے عقود کے مقابلہ میں زائد شرطیں مقرر کیں جن سے نکاح اور سفاح کے درمیان مشابہت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ مثلاً اس کے لیے اعلان کو شرط قرار دیا گیا اور اس کا اظہار کرنے کے لیے دف بجانے اور آواز بلند کرنے اور ولیمہ کی ضیافت کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو خفیہ نکاح ہونے لگیں جو سفاح بصورت نکاح ہیں اور جن سے عقد نکاح کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ پھر مزید تاکید اس میں یہ کی گئی کہ نکاح کی حرمت قائم کرنے کے لیے عدت کا زمانہ استبراء[1] رحم کی مقدار سے زیادہ رکھا گیا اور اس کے ساتھ حرمت مصاہرت کے احکام دیے گئے اور منکوحہ عورت کو میراث بنانے سے منع کیا گیا۔ یہ سب چیزیں مجرد استمتاع پر زائد ہیں اور ان سے مقصود یہ ہے کہ نکاح کو سفاح کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے۔

(۲۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص قرض اور بیع کو ایک ہی معاملہ میں جمع کرے حالانکہ اگر ان دونوں میں کسی ایک صورت پر معاملہ کیا جائے تو وہ درست ہے، اور بجائے خود دونوں طریقے حلال ہیں پس دو حلال طریقوں کو یکجا جمع کرنے سے جو روک دیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں اس کو سود خواری کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے۔ مثلاً ایک شخص کسی کو ایک ہزار روپیہ قرض دے اور اس کے ہاتھ آٹھ سو روپے کا مال فروخت کرکے اس کی قیمت اس دباؤ میں ایک ہزار لگا دے کہ خریدار اس کا قرضدار ہے۔ اس طرح اس نے دیا تو ایک ہزار نقد اور آٹھ سو کا مال، اور وصول کیے دو ہزار یہی معنی ہیں ربوا کے۔ اب غور کرو کہ شارع نے محرمات و ممنوعات کے ذرائع پر کس طرح ہر ہر جانب سے پابندیاں عائد کی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک

[1] واضح ہو کہ استبراء رحم کے لیے صرف ایک حیض آجانا کافی ہے کیونکہ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ عورت حاملہ نہیں ہے۔

ہزار کے عوض ہزار لے اور پانچ سو یں رومال دے تو یہ جائز ہے۔ حالانکہ بیعینہ وہ چیز ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے اور یہ سود خواری کے قریب ترین ذرائع میں سے ہے۔ جو شخص ذریعہ کا دروازہ بند نہیں کرتا اسے چاہیے کہ نصوص کی مخالفت کرے اور ذریعہ کو جائز کر دے، ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان کسی ممنوع فعل کا تارک بھی ہو اور ہر صورت سے اس کے نظائر کا ارتکاب بھی کرتا چلا جائے۔

(۲۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے بیع العینہ کی تحریم پر صریح آثار منقول ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ فروخت کنندہ کے پاس اصل قیمت پر مال کے واپس آجانے کا امکان ہے اگرچہ دونوں کے درمیان ربٰو کا معاملہ باقاعدہ طے نہ ہوا ہو۔ اس کا مقصد ربٰو ہی کا سد باب ہے۔

(۲۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہ کو قرض دار سے ہدیہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی اسی طرح صحابہ نے بھی اس سے روکا۔ ظاہر ہے کہ ہدیہ ناجائز نہیں۔ مگر اس میں خدشہ یہ ہے کہ ہدیہ دے کر قرض دار مہلت قرض میں اضافہ چاہے گا۔ اور قرض دار اس ہدیہ کی وجہ سے مہلت دینے پر راضی ہو جائے گا۔ اس طرح ہدیہ خود بخود سود بن جائے گا، کیونکہ قرض خواہ کو اس کا راس المال بھی واپس ملا اور اضافہ مہلت کے معاوضہ میں ہدیہ بھی ملا پس شارع نے ایک جائز فعل سے محض اس لیے روک دیا کہ وہ بلا ارادہ یا بالارادہ سود خواری کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۲۵) حاکم اور قاضی اور سفارش کرنے والے کو بھی قبول ہدیہ سے منع کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ ہدیہ فساد معاملات کی جڑ ہے۔ امور کو غیر اہل کے سپرد کرنا، اور خائنوں کو عہدے دینا، اور ناکارہ لوگوں کو ذمہ داری کی جگہوں پر مامور کرنا، یہ سب کچھ انہی ہدیوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور ان سے اتنے فسادات پیدا ہوتے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی شخص کسی لیے شخص کا ہدیہ قبول کرتا ہے جس کے ساتھ اس کے کوئی ایسے

لہ بیع العینہ یہ ہے کہ کسی مال کو قرض دینے کی صورت میں اس کی قیمت زیادہ کر دی جائے مثلاً جو چیز نقد ایک روپیہ میں فروخت کی جاتی ہو اس کی قیمت قرض کی صورت میں ایک روپیہ ایک آنہ لگائی جائے۔

گہرے روابط نہ ہوں جن کی بنا پر دونوں کے درمیان ہدایا کا مبادلہ ہوتا رہتا ہو، تو لامحالہ یہ اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ناروا رعایت کرے۔ گو اس کو لالچ نہ ہو، تب بھی یہ خواہش پیدا ہوگی کہ اس ہدیہ کے بدلہ میں اس کی کوئی غرض پوری کرے۔

(۲۶) سنت نبوی یہ ہے کہ جو شخص کسی کو قتل کر دے وہ مقتول کی میراث نہیں پا سکتا۔ یہ اس لیے ہے کہ قاتل کو وراثت دلوانا کہیں قتل کی ترغیب کا ذریعہ نہ بن جائے، اور کوئی شخص محض کسی کی میراث جلدی پانے کے لیے قتل کا ارتکاب نہ کرے۔ اس مصلحت کو پیش نظر رکھکر عام قاعدہ یہ بنا دیا گیا کہ قاتل کو کسی حال میں میراث نہ ملیگی، خواہ قتل سے اس کی نیت میراث حاصل کرنے کی ہو یا نہ ہو۔ یہ حکم بھی سدّ باب ذریعہ کے قبیل سے ہے۔

(۲۷) مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین کا قاعدہ یہ تھا کہ جس عورت کو حالت مرض میں طلاق بائن دی جاتی اس کو وہ میراث دلواتے تھے، کیونکہ اس حالت کی طلاق میں اس شبہہ کی گنجائش تھی کہ شاید اس سے مقصد عورت کو ورثہ سے محروم کرنا ہو۔ پس انہوں نے عام قاعدہ یہی بنا لیا کہ خواہ عورت کو محروم کرنا مقصود ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ ایسی مطلقہ کو میراث دلائیں گے تاکہ طلاق کو اس ظلم کے لیے ذریعہ نہ بنا لیا جائے۔ جس جگہ ایسے شبہہ کی گنجائش نہ ہو وہاں بھی اس عام قاعدہ میں استثنا نہیں کیا گیا کیونکہ وہ باب ذریعہ کو بالکلیہ بند کرنا چاہتے تھے، اور بعض کا خیال یہ بھی تھا کہ جب مرض الموت کی حالت شروع ہوگئی تو شوہر کے مال میں عورت کا حق واجب ہوگیا اور اس حق کو قطع کرنا ممکن نہیں۔ اس مسئلہ میں جو اختلاف ہوا ہے وہ سابقین کے اجماع سے متأخر ہے۔

(۲۸) صحابہ اور عامۂ فقہاء کا بالاتفاق یہ فتویٰ ہے کہ ایک شخص کو اگر چند آدمیوں نے مل کر قتل کیا ہو تو سب سے قصاص لیا جائے گا۔ اگرچہ یہ بات اصول قصاص کے خلاف ہے، لیکن یہ فتویٰ اس لیے دیا گیا کہ کہیں عدم قصاص، خونریزی میں تعاون کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۲۹) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت جنگ میں سارق کا ہاتھ کاٹنے سے منع کر دیا محض اس لیے کہ

حد کا خوف کہیں سارق کو کفار سے جا ملنے پر آمادہ نہ کر دے۔ اسی بنا پر حالت جنگ میں اقامت حد و د موقوف رکھنے کا عام قاعدہ جاری ہوا۔

(۳۰) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان سے ایک دن یا دو دن قبل روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی الا یہ کہ کسی شخص کو کسی خاص دن روزہ رکھنے کی عادت ہو اور اتفاق سے وہ دن رمضان سے متصل آجائے اسی طرح حضور نے یوم الشک کے روزے سے بھی منع فرمایا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ یہ فرض اور غیر فرض کی تمیز اٹھ جانے کا ذریعہ نہ بن جائے اور لوگ فرائض کے ساتھ خود اپنی اختراع سے غیر فرائض کو ملحق نہ کرنے لگیں۔ اسی طرح حضور نے یوم عید کا روزہ حرام کر دیا کہ وقت عبادت اور غیر وقت عبادت کی تمیز باقی رہے اور لوگ اپنی طرف سے فرائض میں اضافہ نہ کرنے لگیں جیسے کہ نصاریٰ اس سے پہلے کر چکے ہیں اس باب میں شارع نے بہت احتیاطیں کی ہیں مثلاً افطار میں تعجیل اور سحر میں تاخیر کا حکم دیا تاکہ لوگ روزہ کی مقدار مقررہ میں بطور خود اضافہ نہ کرلیں۔ عید کے روز نماز سے پہلے افطار میں جلدی کرنے کا استحباب بھی اسی لیے ہے۔ نیز آپ نے حکم دیا کہ فرض نماز اور نفل نماز میں فرق کیا جائے اور امام کیلئے اس فعل کو مکروہ قرار دیا کہ وہ اپنے مصلے پر سنن و نوافل ادا کرے حتیٰ کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس کے قبلہ رو بیٹھے رہنے کو بھی ناپسند فرمایا۔ یہ تمام احکام اسی لیے ہیں کہ شارع زیادت فی الفرض کے چھوٹے سے چھوٹے ذریعہ کا بھی سد باب کرنا چاہتا ہے۔

(۳۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ کسی ایسی چیز کو نماز کے وقت سامنے نہ رہنے دیا جائے جس کی عبادت مشرک قوموں میں رائج ہو حتیٰ کہ آپ نے اس کو بھی ناپسند فرمایا کہ نماز کے وقت کسی لکڑی یا ستون یا درخت وغیرہ کی طرف رخ کیا جائے۔ آپ کی ہدایت یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز سامنے ہو تو اس سے ذرا سا رخ پھیر کر پڑھو تاکہ وہ ٹھیک سامنے نہ رہے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ سجود لغیر اللہ کے ساتھ تشبہ کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۳۲) آپ نے شفعہ کو مشروع فرمایا اور شریک کو یہ حق دیا کہ وہ خریدار کے ہاتھ سے براہ راست اپنا حصہ لے لے اس سے مقصود ان جھگڑوں کا سدِ باب تھا جو شرکت اور تقسیم میں پیدا ہوتے ہیں۔

(۳۳) حاکم کو منع کیا گیا ہے کہ وہ فریقین میں سے ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ اونچی جگہ دے یا ایک فریق کی طرف زیادہ متوجہ ہو، یا اس سے مشاورت کرے، یا اس کے لیے تعظیماً کھڑا ہو۔ مقصود یہ ہے کہ حاکم کا یہ طرزِ عمل کہیں فریق ثانی کو مایوس اور دل شکستہ نہ کر دے، اور ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے مخالف کو حاکم کے پاس زیادہ باا ثر پا کر اپنی حجت پوری قوت کے ساتھ پیش نہ کر سکے اور یہ بے انصافی کا ذریعہ بن جائے۔

(۳۴) حاکم کو اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرنے سے منع کر دیا گیا تاکہ یہ بھی بے انصافی کا ذریعہ نہ بن جائے اور ایسا نہ ہو کہ حاکم غلط فیصلے کرنے لگیں اور بہانہ یہ کریں کہ ہم اپنے ذاتی علم کی بنا پر ایسا فیصلہ کر رہے ہیں۔

(۳۵) شریعت نے کسی شخص کے مقابلہ میں اس کے دشمن کی شہادت قبول کرنے سے منع کر دیا، خواہ وہ کیسا ہی سچا آدمی ہو۔ شاہد کے صادق یا غیر صادق ہونے کا لحاظ کیے بغیر یہ عام قاعدہ اسی لیے بنایا گیا ہے کہ دشمنی کی بنا پر باطل شہادت دینے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے۔

(۳۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بآوازِ بلند پڑھنے سے روک دیا تاکہ یہ کفار میں جہالت کا جوش پیدا کرنے اور ان کی زبان سے قرآن اور اللہ تعالیٰ اور جبریلؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گالیاں نکلوانے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۳۷) اللہ تعالیٰ نے گناہ کے بعد توبہ کرنے والے کو ایسا قرار دیا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں، جو شخص توبۃ النصوح کے بعد خدا کے سامنے حاضر ہوگا اس کو اس گناہ پر عذاب نہ دیا جائے گا جس سے وہ توبہ کر چکا ہے۔ مگر احکامِ دنیا کا حال اس سے مختلف ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسا جرم کرے جس کے

لیے شرعی سزا مقرر ہو اور پھر گرفتاری کے بعد توبہ کرنے لگے تو یہ اس کو سزا سے نہ بچائے گی خواہ اس کی توبہ توبۃ النصوح ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اس لیے کہ کہیں توبہ کو تعطیل حدود اللہ کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے۔ ہاں اگر وہ امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی سچی توبہ کر چکا ہو تو اصح قول علماء یہ ہے کہ اس پر سے حد ساقط ہو جائیگی[1]

(باقی)

[1] سچی توبہ کی علامت یہ ہے کہ توبہ کے بعد پھر اس نے جرم کا اعادہ نہ کیا ہو۔ اور مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ بالفرض ایک شخص پہلے جرم کرتا تھا۔ پھر اس نے توبہ کر لی اور جرم کرنا چھوڑ دیا اور ثابت ہو گیا کہ اس نے نیک زندگی اختیار کر لی ہے تو اب اس کو پرانے جرم کی بنا پر گرفتار کرنا اور سزا دینا درست نہیں۔ یہ اس لیے کہ کہیں تعزیر میں اتنا مبالغہ لوگوں کو جرائم میں مبتلا رکھنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ جب ایک دفعہ جرم کرنے کے بعد ایک شخص کو یقین ہو کہ اب میں بہر حال سزا کا مستوجب ہی ہو چکا ہوں اور سزا سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ لاؤ اب دل کھول کر ہی کیوں نہ جرم کریں۔

صدر اسلام میں فتوے کی حیثیت

رعایت مصالح شرعیہ

از جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی (علیگ)

جزیرۂ قبرص کو فرنگیوں کی اصطلاح میں سائپرس کہتے ہیں، یونان کے دیوتاؤں اور دیویوں کو یہ جزیرہ بہت محبوب تھا، جن کے حسن و عشق کی بہتیری کہانیاں اب تک زبان زد ہیں۔ بتوں کی شان خدائی یہاں ہر رنگ میں خود نمائی کر رہی تھی۔ رومی اگرچہ نصرانی ہو گئے تھے مگر بت پرستی کی صرف شکل بدل گئی تھی ہجرت نبوی کے ستائیسویں سال تک یہی بت فرمانروا تھے۔ اٹھائیسویں سال خدا کی خدائی نے بتوں سے بادشاہی چھینی

فتح قبرص سیدنا عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے کفر و شرک سے اس زمین کو پاک کر کے اللہ کی سلطنت بلند آوازہ فرمائی۔

سردیوں کا زور ٹوٹتا تھا کہ فرزندان توحید کے دل گرما گئے، زمانہ کے سرد و گرم نے جن کو پختہ کار بنا رکھا تھا وہی اس مہم میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد صحابی پیش پیش تھے۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی بیوی بھی کہ صحابیہ تھیں اس غزوہ میں ساتھ تھیں اور یہیں شہید ہوئیں تیسری صدی ہجری کے بعد تک "مزار نیک زن" کے نام سے ان کا مشہد معروف تھا۔

آزادی برقرار خدا کا لشکر شیطان کی جمعیت پر غالب آیا، بت پرستوں کو خدا پرستوں کے سامنے جھکنا پڑا، صلح کی درخواست کی جس کی شرطیں یہ تھیں۔

۱۔ اہل قبرص سات ہزار دو سو سالانہ جزیہ دیا کریں گے۔

۲۔ اسلام کے خلاف دشمنان اسلام کو مدد نہ دیں گے۔

(۳) اسلام اپنے غزوات میں ان سے مدد نہ لے گا۔

(۴) آزادی یہاں تک محفوظ ہوگی کہ نصرانی سلطنت سے بھی ان کے تعلقات قائم رہیں گے

عہد شکنی | ہنوز اس معاہدہ کی سرسبزی کو چار پانچ بہاریں دیکھنی نصیب نہ ہوئی تھیں کہ اہل قبرس نے اسلام کے خلاف نصرانیت کو مدد دی اور ان کے جنگی جہازوں کے ساتھ نصرانیوں نے دیار اسلام پر لشکر کشی کی۔

تکرر فتح | اب کے معاویہ رضی اللہ عنہ کو استیصال کفر کا پورا سامان کرنا تھا۔ ۳۳ھ میں ایک بحری مہم مرتب ہوی، جہازرانی اور دریانوردی کے سامان خوگر نہ تھے، لیکن اس غزوہ میں پانسو جنگی جہازوں کا ایک ہولناک بیڑہ تیار ہوگیا جس نے تیر اور تلوار کی زبان سے قبرس کو خدا کا پیغام سنایا، اہل قبرس ماننے والے تو نہ تھے مگر آسمان کی بات زمین کو ماننی ہی پڑتی ہے، سرزمین قبرس کو بری طرح شکست کھانی پڑی، پورا جزیرہ زیر شمشیر آگیا بعلبک کے بارہ ہزار مسلمان وہاں منتقل کر دیے گئے کہ ہر جگہ مسجدیں بنائیں اور علانیہ اللہ کی عبادت کریں۔

آزادی باقی رکھی | جزیرہ کو بزور شمشیر فتح بھی کر لیا، اسلام کا پورا تسلط بھی ہوگیا۔ بایں ہمہ ملکی آزادی برقرار رکھی، جو معاہدہ پہلے ہوا تھا وہی اب بھی قائم رہا۔

شرک کا سلوک توحید کے ساتھ | قبرس میں مسلمانوں نے اپنا ایک شہر آباد کر لیا تھا، یزید کی حکومت ہوئی تو اہل قبرس نے اپنی عاجزانہ فرمانبرداری کا ایسا کچھ یقین دلایا کہ اظہار وفاداری کی اس رشوت سے شاد ہو کے اس نے تمام مسلمانوں کو واپس کر لیا۔ میدان کا خالی ہونا تھا کہ پورا جزیرہ اسلام اور ایمان سے خالی ہوگیا، مسجدیں ڈھادی گئیں، شہر مسمار ہوگیا اور توحید کا شعار تک باقی نہ رہا۔ مگر مسلمانوں نے صرف اس لیے یہ سب کچھ گوارا کیا کہ اہل جزیرہ ہمارے ذمی ہیں۔ جزیہ دیتے ہیں ہم ان کی آزادی میں خلل انداز کیوں ہوں؟

اضافۂ مالیہ | اس عام نے قبرس کی مالی حالت کو نہایت ترقی دی اور آبادی بھی بڑھ گئی، عبد الملک بن مروان نے اپنے عہد میں ایک ہزار کا اضافہ کر دیا، یعنی جزیہ کی مقدار جو پہلے سات ہزار دینار سالانہ تھی، اب آٹھ ہزار ہو گئی، عمرؓ بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے تو اس اضافہ کو منسوخ کر دیا، مگر ان کے بعد ہشام بن عبد الملک نے پھر بحال کر دیا، بنی امیہ کی سلطنت جب دولت عباسی سے تبدیل ہوئی تو دوسرے عباسی حکمران (ابو جعفر منصور) کے دربار میں یہ معاملہ پیش ہوا جنہوں نے اضافہ کو قطعاً مسترد کر دیا، اس موقع پر جو الفاظ استعمال ہوئے وہ یہ تھے :۔

"ہماری شان یہی ہے کہ ان کے ساتھ انصاف کریں اور بار بار کی خود سری و لشکر کشی کے مقابلہ میں تحمل سے پیش آئیں۔"

ہمیشہ سازش کی اور ہمیشہ معافی لی | مسلمانوں کو تو یہ فکر تھی کہ اسلامی سلطنت کا طرز عمل اسلام کے شایان شان رہنا چاہیے، مگر اہل قبرس کی فرصت طلب سرشت کہیں ہنگامہ گستری سے باز آنے والی تھی، باطل کو ایک ذرا موقع ملا کہ حق کے خلاف بغاوت شروع کر دی، ولید بن عبد الملک نے ان سازشوں سے تنگ آکر سازش گروں کو صبح فتنہ کے پہنچتے ہی شام کو جلائے وطن کر دیا، لیکن مسلمانوں کی عام رائے اس کی مخالف ہوئی کہ یزید بن عبد الملک نے ان لوگوں کو پھر ان کے وطن واپس کر دیا موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں ہارون علیہ السلام جب خلیفہ ہوئے تو بنی اسرائیل کو فتنۂ سامری کا موقع ملا تھا، موسیٰ ہادی کی خلافت جب ہارون رشید کو ملی تو قبرس نے اسی قدیم تاریخ کا اعادہ کرنا چاہا، بغداد میں خبر پہنچی اور حُمید بن مَعیُوف کی سرکردگی میں دجلہ سے ایک سرکوب مہم رواں ہوئی جس نے باغیوں کو گرفتار کر کے بارگاہ سلطنت میں پیش کر دیا، سرکشوں نے پھر سر تسلیم خم کیا، عہد اطاعت کی تجدید کی، اور شان عفو نے پھر قصور معاف کرنے کی اجازت دے دی۔

شریعت سے استفسار | ان مسلسل ہنگاموں سے تنگ آکر سلطنت نے علماء سے فتویٰ طلب کیا کہ اہل قبرس

جزیہ دیتے ہیں، اہل ذمہ ہیں، مگر فتنہ انگیز۔ شریعت ان کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت دیتی ہے؟

یہ استفتاء بہت مختصر تھا۔ آج کل کے علماء دین و مفتیان شرع متین ایک ہی مسئلہ کے متعلق اختلاف بیان کے ساتھ اگر دس استفتے پیش ہوں تو اصل واقعہ کی تحقیق سے کچھ سروکار نہ رکھیں گے اور اسی ایک مسئلہ کے جواب میں دس مختلف فتوے دیں گے، لیکن اس زمانہ کے پیشوایان اسلام کی یہ روش نہ تھی وہ دنیائے اسلام کے حالات اور زمانہ کی رفتار سے بھی آگاہ ہوتے تھے، پہلے واقعہ کی تحقیق کر لیتے پھر فتوی دیتے سلطنت کے استفتاء کے جواب جو ائمۂ اسلام نے دیے، اختلاف اجتہاد کی بنا پر مختلف تو وہ بھی تھے۔ مگر واقعات پر سب نے بحث کی اور سیاست سب کے پیش نظر تھی۔

سعدؓ بن لیث کا فتوی قبرس کے لوگ ایسے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے فریب اور نصرانی دشمنان خدا کے ساتھ اخلاص کا الزام ہماری نظر میں ہمیشہ ان پر عائد رہا۔ اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ کسی قوم سے خیانت کا خوف ہو تو ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو، یہ نہیں فرمایا کہ جب تک خیانت کا یقین نہ آجائے ویسا برتاؤ نہ کرو لہذا میری رائے میں ان کے ساتھ جیسی کرنی ویسی بھرنی کا عمل ہونا چاہیے۔ البتہ ایک برس کی مہلت دیدی جائے، اس دوران میں جس کا جی چاہے ذمی بن کر اسلامی ممالک میں آجائے اور خراج ادا کرتا رہے، جو چاہے نصرانیوں کے ملک میں چلا جائے، اور جو قبرس میں رہے وہ جماعت برسر جنگ سمجھی جائے، ختم مہلت کے بعد ان پر مسلسل حملے ہوتے رہیں، سال بھر کی مہلت دینے میں اتمام حجت بھی ہے اور وفائے عہد بھی۔

امام مالکؒ "والیان اسلام کی جانب سے اہل قبرس پرانے مستامن چلے آتے ہیں۔ سبب یہ تھا کہ والیان اسلام کی نظر میں ان لوگوں کا اس حالت میں باقی رکھنا باطل کی تذلیل اور حق کی تقویت ہے مسلمان ان سے جزیہ لیتے ہیں اور دشمنوں سے ان کو بچاتے ہیں، میں نے کوئی ایسا والی نہیں پایا کہ جس نے اس معاہدہ مصالحت کو جو ان کے ساتھ ہوا تھا، توڑ دیا ہو۔ اور ان کے وطن سے انہیں نکال باہر کیا ہو۔ میری رائے

میں شتابکاری نہ کیجیے، عہد شکنی اچھی نہیں، پہلے اتمام حجت تو ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس مدت کے لیے ان کے ساتھ معاہدہ ہوا ہو اس کو پورا کرو، اس مدت کے بعد بھی ان کی حالت درست نہ ہوئی، فریب وخیانت سے باز نہ آئے، اور خود آپ نے دیکھ لیا کہ ان کی غداری مسلم ہے، تو پھر ان کو سزا دینی چاہیے یہ کارروائی اتمام حجت کے بعد ہوی تو اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ اور ان کو رسوا و ذلیل فرمائے گا۔"

سُفیان بن عُیَینَہ | ہمیں معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی گروہ سے عہد کیا ہو اور اس گروہ نے عہد توڑ دیا ہو۔ پھر بھی آنحضرت علیہ السلام نے ان کا قتل حلال نہ ٹھیرایا ہو۔ البتہ اہل مکہ اس سے مستثنیٰ ہیں، کہ آنحضرت صلواۃ اللہ علیہ نے ان پر احسان فرمایا۔ اہل مکہ کی عہد شکنی یہ تھی کہ بنی خزاعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے مگر مکہ والوں نے خزاعہ کے خلاف اپنے حلیفوں کو مدد دی اہل نجران کے معاہدہ میں سودخواری کی ممانعت تھی، جب وہ اس سے باز نہ آئے تو سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ جلائے وطن کر دیے جائیں۔ تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ ذمّی نے عہد شکنی کی تو اسلام کی حفاظت سے خارج

موسیٰ بن اَعیَن | ایسے حالات پہلے بھی پیش آیا کرتے تھے جن میں والیان اسلام مہلت و انتظار سے کام لیا کرتے تھے، سلف صالح میں سے کسی نے اہل قبرص وغیرہ کو عہد شکن قرار نہیں دیا، خواص تو رومیوں سے مل گئے لیکن شاید عوام ان کے شریک نہیں، ان کی جانب سے جو ہوا وہ ہوا، بایں ہمہ میری رائے میں ان کے ساتھ وفائے عہد و تکمیل شرط کا سلوک ہونا چاہیے، ذمیوں کی ایک جماعت نے مسلمانوں سے صلح کر کے مشرکوں کی راہ نمائی کی کہ مسلمانوں کے فلاں فلاں کمزور پہلو ہیں، ان کی نسبت اوزاعی (رضی اللہ عنہ) کو میں نے کہتے ہوئے سنا تھا کہ یہ اگر ذمّی تھے تو خود ہی عہد شکنی کر کے اسلام کی حفاظت سے نکل گئے، اب والی کو اختیار ہے چاہے انہیں مار ڈالے چاہے انہیں پھانسی دے، لیکن اگر بحالت صلح اسلام کی حفاظت میں داخل نہیں ہوئے تھے تو صورت واقعہ میں والی کو ان کے ساتھ وہی کرنا چاہیے جو انہوں کیا تھا، خائنوں کے داؤ پیچ کو اللہ پسند نہیں کرتا۔

اسماعیل بن عیاش | قبرس کے لوگ ذلیل ہیں، مقہور ہیں، رومی ان پر غالب ہیں، جانیں بھی انہیں کے قبضے میں ہیں، عورتیں بھی انہیں کے زیر اثر ہیں، ہمارے لیے اس حالت میں یہی مناسب ہے کہ ان کی حفاظت کریں۔ حبیب بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) نے اہل تغلب کے عہدنامے میں لکھا تھا کہ اگر مسلمان کسی ایسے شغل میں مصروف ہوں کہ دشمن تم پر غالب آجائے اور اسلامی طاقت بچا نہ سکے تو اس حالت میں بھی معاہدہ برقرار رہے گا بشرطیکہ مسلمانوں کے ساتھ تمہاری وفاداری برقرار رہے۔ اہل قبرس کے ساتھ جو عہد ہوا تھا اور جو ذمہ داری ہم نے اپنے سر لی تھی، میری رائے میں اس کو برقرار رکھنا چاہیے۔ ولید بن عبدالملک نے جب ان کو شام میں جلائے وطن کیا تھا تو مسلمانوں نے اس کو بہت برا جانا اور فقہا پر سخت گراں گزرا تھا، یزید بن عبدالملک نے جلاوطنی کو منسوخ کر کے جب انہیں وطن واپس بھیجا تو مسلمانوں نے اس فعل کو پسند کیا اور اس کو عدل و انصاف سمجھے۔

یحییٰ بن حمزہ | قبرس کا معاملہ عربسوس کے مماثل ہے، وہاں جو ہوا وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ عربسوس کا واقعہ یہ ہے کہ عُمیر بن سعدؓ نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی جناب میں حاضر ہو کے گذارش کی کہ ہمارے اور نصرانیوں کے درمیان ایک شہر عربسوس ہے، یہ لوگ ہماری کمزوریوں سے تو دشمنوں کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ مگر دشمنوں کے عمل کی ہمیں خبر تک نہیں دیتے، عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہاں جانا تو دو صورتیں اختیار کرنا، ایک تو یہ ہے کہ ایک بکری کے بدلے دو بکریاں، ایک گائے کے بدلے دو گائیں، ایک ایک چیز کے بدلے دو دو چیزیں دینا اگر راضی ہوئے تو سب کو جلائے وطن کر دینا۔ اور آبادی کو ویران کر دینا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ راضی نہ ہوں تو ایک سال کی مہلت دینا اور مدت گزرنے کے بعد شہر کو مسمار کر دینا۔ عُمیر نے واپس جا کے اسی پر عمل کیا۔ اہل عربسوس جلائے وطنی پر راضی نہ ہوئے تو سال بھر کی مہلت دی اور انقضائے میعاد کے بعد عربسوس کو ویران کر دیا۔ عربسوس کے ساتھ بھی وہی معاہدہ تھا جو قبرس کے ساتھ ہے بایں ہمہ اہل قبرس کو اگر اسی قدیم مصالحت پر باقی رکھا جائے اور مسلمانوں کے جو کام وہ انجام دیتے ہیں اس میں حسب معمول ان سے مدد لیتے رہیں تو یہ بہتر ہے۔ اصولی مسألہ یہ ہے کہ جن لوگوں سے معاہدہ ہو جنگ کے موقع پر اگر وہ مسلمانوں کے پیچھے دشمنان اسلام سے

نہ لڑیں گھر میں بیٹھے رہیں۔ اور وہیں ان پر احکام جاری ہوں، تو وہ اہل ذمہ نہیں ہیں، اہل فدیہ ہیں۔ جب تک شک سے باز رہیں ہمیں بھی باز رہنا چاہیئے وفادار رہیں تو ہم پر وفائے عہد لازم ہے، زر محصول دیتے رہیں تو قبول کرنا چاہیئے، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ دشمنوں کے ساتھ ایسی مصالحت کو مکروہ سمجھتے تھے جس میں کوئی مقدار مقرر ہو البتہ اگر مسلمان صلح پر مجبور ہوں تو یہ دوسری صورت ہے، کون جانتا ہے کہ ایسے حالات پیش آئیں کہ یہی صلح شائد مسلمانوں کے حق میں نفع و عزت کا سبب بن جائے۔

ابو اسحاق و مخلد رحمہم اللہ | ابو اسحاق الفزاری اور مخلد بن الحسین دونوں بزرگوں کا فتویٰ ایک تھا، عربوں سے دونوں حضرات نے استشہاد کیا تھا، حذف تکرار کے بعد جو عبارت تھی اس کا مفہوم یہ ہے:۔

اوزاعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے تھے کہ فتح قبرس کے بعد اہل قبرس اپنی حالت سابقہ پر چھوڑ دیئے گئے، چودہ ہزار دینار سالانہ پر صلح ہوئی تھی کہ سات ہزار مسلمانوں کو دیں اور سات ہزار رومیوں کو، یہ بھی شرط تھی کہ مسلمانوں کے حالات رومیوں سے مخفی رکھیں، اوزاعی یہ بھی کہتے تھے کہ اہل قبرس نے ہمارے ساتھ کبھی وفا نہیں کی، ہماری رائے میں وہ زیر معاہدہ ہیں ان کے صلح نامہ میں کچھ شرطیں ان کے حق میں ہیں کہ ہم ان کے ذمہ دار ہیں، اور کچھ شرطیں ہمارے حق میں ہیں جن کی بجا آوری ان پر لازم ہے۔ اس معاہدہ کا توڑنا اس وقت تک ٹھیک نہیں جب تک ان کی غداری و بدعہدی کھل کے نمایاں نہ ہو۔

اصلی نصوص | یہ تو ان فتووں کے خلاصے تھے، اصل فتوے جو متون میں ثبت ہیں ان کی عبارتیں ملاحظہ ہوں:

اللیث بن سعد - ان اھل قبرس قوم لم نزل نتھمھم بغش اھل الاسلام ومناصحۃ اعداء اللہ الروم، وقد قال اللہ تعالیٰ وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَومٍ خِیَانَۃً فَانْبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَآءٍ ولم یقل لاتنبذ الیھم حتی تستیقن وانی اری أن تنبذ الیھم وینظروا سنۃ یأتمرون، فمن احب منھم اللحاق ببلاد المسلمین علی ان یکون ذمۃ یؤدی الخراج قبلت ذالک منہ ومن اراد ان ینتھی الی بلاد الروم فعل ذٰ

اراد المقام بقبرس علی الحرب اقام فکانوا عدوًا یقاتلون ویغزون فان فی انظار
سنة قطعا لحجتهم ووفاءً بعهدهم۔

مالک بن انس — ان امان اهل قبرس کان قدیما متظاهرًا من الولاة
لهم وذلک لانهم رأوا ان اقرارهم علی حالهم ذلٌ وصغارٌ لهم وقوةٌ
للمسلمین علیهم بما یاخذون من جزیتهم ویصیبون به من الفرصة فی عدوهم
ولم اجد احدًا من الولاة نقض صلحهم ولا اخرجهم عن بلادهم وانا اری
ان لا تعجل بنقض عهدهم ومنابذتهم حتی تتم الحجة علیهم فان الله یقول
فَاَتِمُّوْا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰی مُدَّتِهِمْ فان هم لم یستقیموا بعد ذالک ویدعوا
غشهم ورایت ان الغدر ثابتٌ منهم اوقعت بهم فکان ذالک بعد الاعذار
فرزقت النصر وکان بهم الذل والخزی ان شاء الله تعالیٰ۔

سفیان بن عیینة — انا لا نعلم النبی صلی الله علیه وسلم عاهد قومًا
فنقضوا العهد الا استحل قتلهم غیر اهل مکة فانه منّ علیهم وکان نقضهم
انهم نصروا حلفاءهم علی حلفاء رسول الله صلی الله علیه وسلم من خزاعة
وکان فیما اخذ علی اهل نجران ان لا یاکلوا الربا فحکم فیهم عمر رحمه الله
حین اکلوه باجلائهم فاجماع القوم انه من نقض عهدًا فلا ذمة له۔

موسیٰ بن اعین — قد کان یکون مثل هذا فیما خلا فیعمل الولاة فیه
النظرة ولم ار احدًا ممن مضی نقض اهل قبرس ولا غیرها ولعل عامتهم و
جماعتهم لم یمالؤا علی ما کان من خاصتهم وانا اری الوفاء لهم و
التمام علی شرطهم وان کان منهم الذی کان وقد سمعت الاوزاعی

يقول في قوم صالحوا المسلمين ثم اخبروا المشركين بعورتهم ودلوهم عليها انهم ان كانوا ذمة فقد نقضوا عهدهم وخرجوا من ذمتهم فان شاء الوالى قتل وصلب وان كانوا صلحاً لم يدخلوا فى ذمة المسلمين نبذ اليهم الوالى على سوآءٍ ان الله لَا يحب كيد الخائنين ۔

اسمٰعيل بن عياش ۔ اهل قبرس اذلاء مقهورون يغلبهم الروم على انفسهم ونسائهم فقد يحق علينا ان نمنعهم ونحميهم وقد كتب حبيب بن مسلمة لاهل تفليس فى عهده انه ان عرض للمسلمين شغل عنكم وقهركم عدوكم فان ذلك غير ناقض عهدكم بعد ان تفوا للمسلمين وانا ارى ان يقروا على عهدهم وذمتهم فان الوليد بن عبد الملك قد كان اجلاهم الى الشام فاستفظع ذلك المسلمون واستعظمه الفقهاء فلما ولى يزيد بن عبد الملك ردهم الى قبرس فاستحسن المسلمون ذلك من فعله ورأوه عدلاً

يحيٰى بن حمزة ۔ ان امر قبرس كامر عربسوس فان فيها قدوة حسنة و سنة متبعة وكان من امرها ان عمير بن سعد قال لعمر بن الخطاب وقدم عليه ان بيننا وبين الروم مدينة يقال لها عربسوس وانهم يخبرون عدونا بعوراتنا ولا يظهرونا على عورات عدونا فقال عمر فاذا قدمت فخيرهم ان تعطيهم مكان كل شاة شاتين ومكان بقرة بقرتين ومكان كل شئ شيئين فاذا رضوا فاعطهم اياه واجلهم واخربها فان ابوا فانبذ اليهم واجلهم سنة ثم اخربها فانتهى عمير الى ذلك فابوا فاجلهم سنة ثم اخربها وكان لهم عهد كعهد اهل قبرس وترك اهل قبرس على صلحهم

وَالاستعانة بما یؤدُّون علی امور المسلمین افضل وکلُّ اهل عهد لا یقاتل المسلمون من وراءهم ویجری علیهم احکامهم فی دارهم فلیسوا بذمة ولکنهم اهل فدیة یُکَفُّ عنهم ما کفّوا ویوفی لهم بعهدهم ما وفوا ورضوا ویقبل عفوهم ما ادّوا ' وقد روی عن معاذ بن جبل انه کره ان یصالح احدٌ من العدو علی شیءٍ معلومٍ الا ان یکون المسلمون مضطرون الی صُلحهم لانه لا یدری لعل صلحهم نفعٌ وعز للمسلمین ۔

ابو اسحاق الفزاری ومخلد بن الحسین ۔۔ انا لم نر شیئاً اشبه بامر قبرس من امر عربسوس، وما حکم به فیها عمر بن الخطاب، فانه عرض علیهم ضعف مالهم علی ان یخرجوا منها او نظرة سنةٍ بعد نبذ عهدهم الیهم فابوا الاولی فأُنظِروا ثم اخربت وقد کان الاوزاعی یحدث ان قبرس فتحت فترکوا علی حالهم وصولحوا علی اربعة عشر الف دینار سبعة الف للمسلمین وسبعة الف للروم، علی ان لا یکتموا الروم امر المسلمین' وکان یقول ما وفی لنا اهل قبرس قطعوا نالنری انهم اهل عهد وان صلحهم وقع علی شیءٍ فیه شرط لهم وشرط علیهم و لا یستقیم نقضه الا بامر معروف فیه غدرهم ونکثهم ۔

تنزیل و تاویل

تفسیر آیہ - ماکان للنبی ان یکون لہٗ اسریٰ

از جناب مولوی محمد داؤد اکبر صاحب اصلاحی

قرآن مجید کے ایک طالب علم اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں؟

”آیات مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ... لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (انفال) کی تاویل میں جو روایات کتب تفاسیر و احادیث میں منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر مختلف وجوہ سے عتاب ہوا کیا واقعتاً ایسا ہی ہے“۔

قبل اس کے کہ آیات مسئول عنہا کی صحیح تاویل کی جستجو کی جائے مناسب ہوگا کہ وجوہ عتاب معلوم کی جائیں تاکہ حقیقت کا سراغ لگانے میں آسانی ہو۔ جو روایتیں تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں ان آیات کے تحت میں نقل کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے عتاب کے حسب ذیل وجوہ مترشح ہوتے ہیں۔

(۱) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر سے مدینہ آکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ صحابۂ کبار کو جمع کرکے اسیران بدر کے بارے میں مشورہ طلب فرمایا۔ مختلف جانب سے مختلف صدائیں اٹھیں صدیق اکبرؓ نے فرمایا اے رسول پاک یہ اپنے ہی اقارب ہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیجیے ممکن ہے آئندہ آستانۂ اسلام پر سر جھکا دیں لیکن فاروق اعظمؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا دین کے معاملہ میں اپنے اور پرائے کی تمیز نہ کرنی چاہیے چنانچہ انہوں نے تمام قیدیوں کو قتل کرنے کا مشورہ دیا اور اس طرح کہ علیؓ عقیل کی گردن ماریں اور حمزہؓ عباس کی، اور میں فلاں کو جو میرا قریبی عزیز ہے تہ تیغ کروں تاکہ کفر و شرک کے

بڑے بڑے ستون ڈہجائیں اور مسلمانوں کو اطمینان کامل نصیب ہو لیکن آپ نے اپنی بے پایاں رحمت و رافت کی بنا پر صدیق اکبر کا مشورہ پسند فرمایا۔ اور اسی کے مطابق قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا اسپر (قتل نہ کرنے پر) یہ عتاب آمیز آیت نازل ہوئی مَاكَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ الآیۃ۔ جس کی وجہ سے آپ اور صدیق اکبرؓ رو پڑے۔

دوسری آیت (لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ) کے دو شان نزول تفسیر کی کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے پر ہوا۔ اس لیے کہ غزوۂ بدر تک اس کی اباحت کا فتویٰ نازل نہ ہوا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا یہ فعل بہت ہی عجلت پر مبنی تھا۔ اس لیے وحی الٰہی نے بلا تاخیر یوں تنبیہ کی۔

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ اگر خدا کی جانب سے تحریر الٰہی نہ گزر چکی ہوتی تو (فدیہ لینے کی وجہ سے) تم سخت غضب میں مبتلا ہو جاتے۔

(۲) متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عتاب مال غنیمت لوٹنے پر ہوا اس لیے کہ مال غنیمت کسی نبی کے لیے بھی حلال نہ تھا وہ تو خیریت ہوئی کہ علم الٰہی میں اس کی اباحت مقدر ہو چکی تھی ورنہ مسلمان سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتے۔ یہ تینوں شان نزول سلف سے بھی کتابوں میں منقول ہیں چونکہ ان کے اقوال کی فہرست بہت طولانی ہے اس لیے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں جسے تفصیل مطلوب ہو اسے تفسیر میں خصوصیت کے ساتھ ابن جریر اور در منثور کی جانب مراجعت کرنی چاہیے۔

اب میرے لیے دو ہی شکلیں ہیں یا تو ان تینوں شان نزولوں کو بلا چون و چرا تسلیم کروں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان احادیث و اقوال کو جن سے یہ شان نزول ترشح ہوتی ہیں اصول تحقیق پر پرکھوں، آسان راہ تو پہلی ہے لیکن محققین کی راہ کے یہ سراسر خلاف ہے، اس لیے ہم ان روایات کو محدثین کے اصول پر جانچیں گے۔ اس کے لیے پہلے چند اصول مسلمہ انھیں کی زبانی بیان کرتے ہیں۔

قال ابن الجوزی کل حدیث رایتہ یخالفہ العقول اویناقض الاصول فاعلم انہ موضوع فلا یتکلف اعتبارہ ای لاتعتبر رواتہ ولا تنظر فی جرحھم او یکون مما یدفعہ الحس والمشاھدۃ او مباینا لنص الکتاب والسنۃ المتواترۃ والاجماع القطعی حیث لایقبل شیء من ذالک التاویل۔الخ (فتح المغیث)	ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر اسی طرح وہ حدیث بھی قابل اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو یا وہ حدیث جو کتاب اللہ یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے مخالف ہو اور جس میں تاویل کی بھی گنجائش نہ ہو۔

امام ابن جوزی کے کہنے کا منشا یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت قابل اعتبار نہ سمجھی جائے گی۔

(۱) جو روایت عقل کے خلاف ہو۔

(۲) جو روایت اصول مسلمہ کے منافی ہو۔

(۳) محسوسات اور مشاہدات کے مخالف ہو۔

(۴) وہ حدیث جو قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی بھی گنجائش نہ ہو۔

ملا علی قاری نے بھی اپنی مشہور کتاب موضوعات کے اختتام میں حدیثوں کے جانچنے کے چند اصول بیان کئے ہیں چونکہ ان کے اور امام ابن جوزی کے اصولوں میں تقریباً توافق ہے اس لیے ان کے اصولوں کا یہاں بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ ہاں جسے تفصیل کی ضرورت ہو اسے ان کی تصنیف کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

امام ابن جوزی نے ساقط الاعتبار ہونے کے وجوہ میں سے یہ دو وجہیں جو بیان کی ہیں کہ روایت کتاب اللہ اور عقل کے معارض ہونے کی صورت میں قابل اعتبار نہ ہوگی یہ دونوں اصول تو صحابہؓ کے عہد مبارک سے معمول بہ ہیں بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے تو انھیں دونوں اصولوں کی بنیاد پر متعدد روایات کی صحت تسلیم کرنے

سے انکار کر دیا ہے۔ اپنے اس دعوے کو مدلل کرنے کے لئے دونوں کی چند مثالیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔۔۔۔

پہلے ہم وہ مثالیں نقل کریں گے جن سے معلوم ہوگا کہ صحابہ نے بہت سی روایات کا اس بنا پر انکار کیا ہے کہ وہ کتاب اللہ کے منافی تھیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور بعض صحابہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا

ان المیت یعذب ببکاء اہلہ علیہ۔ مردہ پر اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے

حضرت عائشہؓ کے سامنے جب یہ روایت بیان کی گئی تو اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کبھی نہیں فرمایا واقعہ اتنا ہے کہ ایک دن آپ ایک یہودیہ کے جنازہ پر گذرے اس کے رشتہ دار اس پر واویلا کر رہے تھے آپ نے فرمایا یہ رو رہے ہیں اور اس پر عذاب ہو رہا ہے۔ اس کے بعد کہا قرآن تمہارے لیے کافی ہے خدا فرماتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی۔ کوئی نفس دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

دیکھیے حدیث چونکہ صریح نص کتاب کے خلاف تھی اس لیے حضرت عائشہؓ نے اسے قبولیت کا درجہ نہ دیا۔

(۲) اسی طرح غزوہ بدر میں مقتولینِ قریش کے مدفن پر کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا۔

هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا۔ خدا نے تم سے جو وعدہ کیا تھا سچ پایا؟

اس پر صحابہ نے (ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے) عرض کی یا رسول اللہ آپ مردوں کو پکارتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ وغیرہ سے روایت ہے کہ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

ما انتم باسمع منھم ولکن لا یجیبون۔ تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے لیکن وہ جواب دینے سے قاصر ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے جب یہ روایت بیان کی گئی تو انہوں نے کہا آپ نے یہ نہیں بلکہ یہ ارشاد فرمایا۔

انھم لیعلمون الآن ما کنت اقول لھم حق۔ وہ اس وقت یقین جانتے ہیں کہ میں ان سے جو کچھ کہتا تھا وہ سچ تھا

اس کے بعد حضرت عایشہؓ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی ۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِى الْقُبُوْرِ ۔ (اے نبی تم مردوں کو (اپنی دعوت) نہیں سنا سکتے اور نہ قبر والوں کو ۔

(۲) ایسے ہی حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے خدا کو دو بار دیکھا مسروق تابعی نے حضرت عایشہ رضؓ سے جا کر پوچھا مادر من ! کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا تھا حضرت عائشہؓ نے کہا تم نے ایسی بات کہی جس کو سن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے جس نے تم سے یہ کہا ہے وہ جھوٹا ہے اور یہ آیتیں پڑھیں ۔

(۱) لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۔ نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے اور وہ لطیف اور خبیر ہے ۔

(۲) وما کان لبشر اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ۔ کسی بشر میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اس سے باتیں کر سکے مگر بذریعہ وحی یا پردہ کی اوٹ سے ۔

اسی طرح کی اور بہت سی روایتیں ہیں جن کی حضرت عایشہ رضؓ نے قرآن کے خلاف پا کر تردید کی ہے ہم نے خوف طوالت کی بنا پر چند ہی مثالوں پر اکتفا کیا ہے ۔

اب ہم وہ مثالیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ صحابہ رضؓ نے بہت سی روایتوں کو خلاف عقل پا کر رد کر دیا ۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضؓ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضؓ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس چیز کو آگ چھو دے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے حضرت ابن عباس نے کہا اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وضو میں گرم پانی بھی استعمال نہ کرنا چاہیے حضرت ابو ہریرہ رضؓ نے کہا اے بھتیجے جب تم آنحضرت کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو (ترمذی)

دیکھئے حضرت ابن عباس نے مذکورہ بالا روایت کو خلاف عقل پاکر کیسا عقلی معارضہ کیا ہے۔

(۲) حضرت عائشہؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو آپ نے اس کو کتاب الٰہی اور عقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے قبولیت کا درجہ نہ دیا اور یہ آیت پڑھی

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

امام ابن جوزی وغیرہ نے صحابہ کرام اور بالخصوص حضرت عائشہ کے اجتہادات سے تحقیق روایت کے جو اصول مستنبط کیے ہیں وہ کتابی ہی نذر ہے بلکہ محدثین میں بھی ایک ایسا گروہ رہا ہے جو بعض روایتوں کو عقل یا نص کتاب کے مخالف ہونے کی وجہ سے تسلیم کرنے میں تامل کرتا رہا ہے گو ان کے رواۃ کتنے ہی ثقہ اور مستند کیوں نہ ہوں۔ تشفی کے لیے چند مثالیں نقل کرتے ہیں۔

(۱) صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا۔

اقض بینی وبین ھذا الکاذب الآثم الغادر الخائن۔ (مسلم کتاب الجہاد) میرے درمیان اور اس جھوٹے اور دغا باز خائن کے درمیان فیصلہ کیجیے۔

چونکہ حضرت علی کی شان میں یہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے اس لیے بعض محدثین نے اپنے نسخہ سے یہ الفاظ نکال دیے۔

(۲) صحیح بخاری میں ہے کہ خدا نے حضرت آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا حافظ ابن حجر جیسے روایت پرست اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔

ویشکل علی ھذا ما یوجد الآن من آثار الامم السالفۃ کدیار ثمود فان مساکنھم تدل علی ان قاماتھم لم تکن مفرطۃ الطول اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں مثلاً قوم ثمود کے مکانات ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر لمبے نہ تھے جیسا کہ

علی اجمالا یقتضیہ الترتیب السابق ولم یظھر الی الآن ما یزیل ھذا الاشکال۔ (فتح الباری)

ترتیب سابق سے ظاہر ہوتا ہے اور اب تک اس کا کوئی حل ظاہر نہ ہوا۔

یہ دونوں اصول ایسے ہیں جو صحابہ رضؓ کے عہد سعید سے لیکر محدثین تک روایات کے جانچنے کا ذریعہ رہے ہیں۔ جو روایت بھی ان کے خلاف پڑی ہے محدثین نے بلا رعایت اسے مردود ٹھیرایا ہے۔ اس کی تائید میں ہم مثالیں پیش کر چکے ہیں اب انھیں اصولوں پر ان روایات کو (جن سے آیات مسؤل عنہا میں عتاب کے اتنے وجوہ مترشح ہوتے ہیں) پرکھتے ہیں۔

ہم نے ان تمام روایات کو (جن سے عتاب کی آٹھ صورتیں نکلی ہیں) مذکورہ بالا اصولوں کی کسوٹی پر کسا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نہ تو وہ قرآن ہی کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور نہ عقل ہی کے۔ اب ہم وہ آیات اور عقلی وجوہ جو مذکورہ عتابوں کے خلاف ہیں ترتیب وار نقل کرتے ہیں۔

(۱) نص کتاب کے خلاف ہیں۔

خداوند تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ رسالت کے لیے وہ ایسے لوگوں کا انتخاب کرتا ہے جو ہر لحاظ سے کامل ہوا کرتے ہیں، اس لیے وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں رضاء الٰہی ہی کے لیے کرتے ہیں۔ ان کا کوئی قدم غلط راہ میں نہیں اٹھتا بسا اوقات تو فریضۂ الٰہی کی ادائیگی میں اس حد تک غلو کر جاتے ہیں کہ خدا کو لعلک باخع نفسک کے محبت آمیز عتاب سے روکنا پڑتا ہے۔ اس قسم کے محبت آمیز عتاب قرآن میں بے شمار مواقع پر ہیں (مثلاً انک لا تسمع من فی القبور۔ انک لا تھدی من احببت۔ ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ) لیکن دراصل یہ عتاب نہیں پیار کے کلمے ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عام لوگوں نے ان آیات کو دوسرے معانی میں لیا ہے جو کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ایسے ہی آیات مسؤل عنہا میں عتاب کا پہلو نکالنا خوش فہمی کا نتیجہ ہے اس لیے کہ قرآن کی بے شمار آیات اس کے معارض ہیں ملاحظہ ہو۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ (طور) امر الٰہی پر ثابت رہو بیشک تم ہماری نگرانی میں ہو۔

(۲) عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا — اسی کو علم غیب حاصل ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو نہیں جتاتا
إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ — بجز اسکے جسے اس نے رسالت کے لیے منتخب کر لیا ہے اس
مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا لِيَعْلَمَ — کے آگے پیچھے محافظ مقرر کر دیتا ہے تاکہ یہ بات ظاہر ہو جائے
أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ (الایۃ جن) — کہ انہوں (رسل) نے اپنے رب کے پیغاموں کو بندوں تک پہنچا دیا
۳۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ) — خدا کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا۔

دیکھیے مذکورۂ بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ نبی خدا کے اشارہ پر چلتا ہے، اس کی تمام حرکات و سکنات خدا اور مقربین خاص کی نگرانی میں ہوتی ہیں۔ اگر نبی فریضۂ تبلیغ و ارشاد میں غلو کر جاتا ہے تو اسے محبت آمیز تنبیہ سے روک دیا جاتا ہے۔ بالفرض اگر نبی سے کوئی اجتہادی غلطی (خدا کی نگرانی میں ہوتے ہوئے) ہو بھی گئی تو اس پر عتاب کے کوئی معنی نہیں۔ ان لیے کہ نبی کو علم غیب تو ہے نہیں اور بغیر راہ صواب دکھائے کسی غلطی پر عتاب تکلیف مالایطاق ہے لیکن ہم تو ثابت کریں گے کہ نبی سے اس مقام پر (اسیران بدر کے بارے میں) کوئی چوک نہ ہوئی۔ نبی نے تو ٹھیک علم الٰہی کے مطابق فیصلہ کیا ان لوگوں کی خوش فہمی کا اس میں بہت زیادہ دخل ہے۔

(۲) عتاب کے تمام وجوہ مذکورہ خلاف عقل ہیں۔

اگر عتاب قتل نہ کرنے پر ہوا جیسا کہ سلف میں سے بعض بزرگوں کا خیال ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مذہب اسلام جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ سارے عالم کے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔ جھوٹ ہے اور مخالفین کا یہ نظریہ کہ جب تک اسلام مکہ میں کس مپرسی کے عالم میں تھا اس وقت تک تو دبا رہا لیکن مدینہ میں آتے ہی (جب ذرا طاقت حاصل ہو گئی) آپے سے باہر ہو گیا اور ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا بالخصوص بدر کی لڑائی میں قوم اسلام کی کتاب میں اسیران بدر کے لئے رہائی کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

(۳) اگر عتاب فدیہ لینے پر ہوا جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے اور سبب عتاب یہی ہے کہ

آنحضرت صلعم اور صحابہ نے اسے قبل از وقت حلال سمجھ لیا حالانکہ فدیہ کا مال اس وقت تک جائز نہ ہوا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی جانب سے اس کی بابت کوئی تصریح تھی یا نہیں؟ اگر نہیں تھی تو اس پر عتاب کے کوئی معنی نہیں اور یہ ثابت ہے کہ اس بارے میں کوئی تصریح نہ تھی روایتیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ فلیراجع۔

(۳) اسی طرح اگر سبب عتاب مال غنیمت کا لوٹنا ہے تو اس میں بھی وہی زحمت پڑے گی اور سوال یہ ہوگا کہ جب اس کی حلت علم الٰہی میں مقدر ہو چکی تھی (جیسا کہ روایات بھی اس کی تائید میں وارد ہیں) تو اس پر عتاب کے کیا معنی؟

سابق تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ آیات متفسر عنہا کے تحت میں جتنے شان نزول بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی نہ تو نقل ہی پر پورا اترتا ہے اور نہ عقل ہی پر۔ یہ تو ممکن نہیں کہ یہ تمام کی تمام روایات ناقابل اعتبار ہوں اس لیے کہ ان میں سے بعض نے صحاح میں بھی جگہ پائی ہے لیکن میں جرأت کر کے یہ ضرور کہوں گا کہ ان میں سے بعض روایتیں راویوں کی بے احتیاطی کی شکار ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اس روایت کو سامنے رکھیے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے مشورہ طلب کرنا مذکور ہے۔ یہ مشورہ تو اپنی جگہ بہت ٹھیک ہے اس لیے کہ حکم تھا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ لیکن اس روایت کا آخری ٹکڑا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ کے رونے اور آپ کے سامنے مثال عذاب پیش ہونے کا تذکرہ ہے۔ اس ٹکڑے کی تضعیف تو علامہ ابن حزم ظاہری نے بھی اپنی کتاب ملل و نحل میں محدثانہ طور پر کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وَاما الجزء الذی فیه لقد عرض علی عذابکم	رہی وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ مجھ پر اس درخت کے
ادنی من هذه الشجرة ولو نزل عذاب	قریب تر عذاب پیش کیا گیا اگر وہ نازل ہو جاتا تو بجز
ما نجی منه الا عمر فهذا خبر لا یصح لان	عمر کے اور کسی کی بھی خیریت نہ تھی یہ روایت صحیح نہیں اس لیے-

المنفرد بروایتہ عکرمۃ بن عمار الیمامی کہ عکرمہ بن عمار یمامی اُنکی روایت میں منفرد ہیں اور یہ وھو ممن قد صح منہ وضع الحدیث و بزرگ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر وضع حدیث اور سوء سوء الحفظ الخ (مل و نحل جلد ۱) حفظ دونوں کا الزام ثابت ہو چکا ہے۔

رہیں وہ روایتیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فدیہ لینے یا مال غنیمت کے لوٹنے پر عتاب ہوا ان میں کا وہ حصہ جس میں مال غنیمت کی حرمت مذکور ہے وہ تو صحیح ہے۔ اس لیے کہ روایات اور توراۃ وغیرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اور قوموں کے لیئے اس قسم کی رقمیں ممنوع تھیں لیکن انہیں یہاں پر چسپاں کرنا کسی طرح مناسب نہیں بخاری شریف میں آپ کے خصائص کے سلسلہ میں مال غنیمت کی حلت کا بیان ضرور ہے لیکن اس واقعہ کا مطلق ذکر نہیں غالباً یہ غیر محتاط مفسرین کا کام ہے۔ واللہ اعلم۔

اب ہم آیات مسئول عنہا کی صحیح تاویل پیش کریں گے لیکن اس کے سمجھنے کیلیے ایک نہایت ضروری اصول بیان کر دوں جس کی طالب قرآن کو ہر ہر قدم پر ضرورت ہے اور جس کے بغیر بعض مواقع پر سخت دھوکا کھانے کا اندیشہ ہے۔

ایک ضروری اصول یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر بات کا کوئی نہ کوئی موقع و محل ہوتا ہے، خواہ کوئی کلام ہو جب تک اس کے موقع و محل کی رعایت کر کے غور نہ کیا جائے گا سمجھ میں آنا ممکن نہیں۔ یہ زحمت تو انسانوں کے کلام میں بھی ہوتی ہے۔ دیوان عرب کا ایک ایک شعر کیوں چیستان بن گیا؟ اس کی محض یہی وجہ ہے کہ بلا موقع و محل کے ان پر غور کیا گیا اور شرحیں لکھدی گئیں۔ اسی اصل کے تغافل سے زمانۂ حال کے بعض مفسرین نے آیت :- اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ الآیۃ (بقرۃ :۸)۔ سے ایمان بالرسالت کو غیر ضروری قرار دے دیا ہے، حالانکہ سورۂ نساء کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ .... اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا" (رکوع ۲۱)۔ ببانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ بغیر ایمان بالرسالۃ

کے ایمان وزابھی قابل اعتبار نہیں........ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں بے شمار ایسی آیات ہیں جو سوال مقدر کے جواب میں واقع ہیں جن مواقع پر سوالات مذکور ہیں وہاں تو کوئی زحمت نہیں لیکن جن مقامات پر سوالات مقدر ہیں وہاں طالب قرآن کو جوابات سے سوالات مقدرہ کی تعیین کرنی چاہیے ورنہ ان آیات کو ٹھیک نہیں سمجھ سکتا، مثلاً اگر کوئی آیت وَاِنْ یَّرَوْا کِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْکُوْمٌ (الطور: ۲) میں جو سوال مقدر ہے اس سے واقف نہ ہو تو وہ اس آیت کو پڑھ کر ضرور سوچ میں پڑ جائے گا کہ خدا نے یہ کیا بات کہدی؟ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔ خوف طوالت مانع نہ ہوتا تو اس پر تفصیلی بحث کرتے۔ میرے خیال میں آیات مسئول عنہا کی تاویل میں اتنے اختلاف کی یہی وجہ ہے کہ اس اصل کی رعایت نہیں کی گئی۔ اگر یہ اصول ملحوظ ہوتا تو کم از کم سبب عتاب میں اختلاف نہ ہوتا اب ہم اس اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیات مسئول عنہا کی تاویل کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ آیات چند در چند سوالات کے جواب میں واقع ہیں وہ یہ ہیں کہ یہود کو مسلمانوں سے سخت عداوت تھی، وہ اسلام کو اپنے لیے سم قاتل سمجھتے تھے، اس لیے اس کے خلاف طرح طرح کے پروپگنڈے کرتے، کبھی کہتے نبوت و رسالت تو بنی اسرائیل کے لیے مخصوص ہے، کبھی کفار کو یوں سبق پڑھاتے کہ آج تک جتنے انبیاء گذرے ہیں سب کے ہاتھوں معجزات و خوارق کا ظہور ہوا ہے۔ ذرا اس مدعی نبوت سے کوئی معجزہ مانگو تو اگر واقعی اپنے دعوی رسالت میں سچا ہوگا تو کوئی نہ کوئی معجزہ دکھلائے گا ورنہ اس کے ادعار رسالت کا پول کھل جائے گا۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ الاٰیۃ (انعام: ۱۲۴) — اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس وقت تک ایمان لانے کے نہیں جب تک اسی طرح کے نشانات جو انبیاء سابقین کو دیئے گئے ہیں ہمیں بھی نہ دیئے جائیں۔

کبھی خود ہی عوام کو بھڑکانے کے لیے طلب معجزہ کرتے۔ ملاحظہ ہو،

قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی اَوَلَمْ یَکْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ (القصص)

وہ کہتے ہیں کیوں نہیں جس طرح موسیٰ کو نشانات دیئے گئے اسے بھی دیے جاتے؟ مگر کیا اس سے پہلے وہ اُن آیتوں کا بھی انکار نہیں کر چکے ہیں جو موسیٰ کو دی گئی تھیں۔

الغرض مذہب اسلام کے خلاف انہوں نے ہر طرح کی تدبیریں کیں بہت سے تو اسلام کو مٹانے کے لیے دوست نما دشمن بن گئے۔ غزوہ بدر جو تاریخ اسلام کی پہلی لڑائی ہے اس کے بھی درپردہ یہی محرک تھے۔ ملاحظہ ہو:۔

وَاِذْ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَہُمْ وَقَالَ لَاغَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْہِ الآیۃ (۸ : ۶)

یاد کرو جب شیطان (یہود) نے کفار کی تدبیروں کو خوشنما کر دکھایا اور کہا آج تم سے کوئی نہیں بازی لے سکتا میں تمہارا ضامن ہوں جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو چپکے سے کھسک گیا۔

لیکن جب کفار کو شکست فاش ہوئی اور یہ لڑائی بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے لیے صاعقہ ہلاکت ہوتی آب زلال ثابت ہوئی تو یہود جل مرے۔ چنانچہ بعضوں نے کہا بھی کہ ... ہم سے مقابلہ پڑا ہوتا تو دکھلا دیتے اس شکست کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ یہود ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے لیکن بھلا وہ اسلام کا بڑھتا ہوا سیلاب کیسے دیکھ سکتے تھے۔ اب انھیں کفار کو از سر نو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرنا تھا اس لیے ایک نہایت موثر تدبیر سوچی اور اپنی تقریر کو اس قالب میں ڈھال دیا کہ نبی تو سراپا رحمت ہوا کرتا ہے۔ مگر یہ تو رسالت کے بھیس میں لوگوں کو قتل کرنے اور لوٹنے ہی میں رہتا ہے۔ بھلا نبی کی شان کے یہ مناسب ہے؟ آیات مسئول عنہا میں انہی سوالات مقدرہ کا جواب دیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو قصر نبوت کی آخری اینٹ ہیں۔ انھیں چھوڑ دو۔ اس قدسی جماعت کا تو ایک ایک فرد اس سے کہیں ارفع ہے کہ قید و بند کرے قتل و خونریزی تو بہت دور کی چیز ہے۔ اور اس ملکوتی گروہ میں سے کوئی بھی اس خاکدان عالم میں ملوکیت کے لیے نہ آیا تھا

ملکہ سب کے سب ارض الٰہی سے شر و فساد کو دور کرنے آئے تھے۔ اسی لیے ہر ایک نے احقاق حق اور ابطال باطل میں جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ پر عمل کیا ہے لیکن جب پرستاران باطل نے اپنی پوری طاقت سے حامیان حق پر حملہ کیا ہے تو انہوں نے حق کے لیے جنگ کی ہے۔ اس میں قید و بند کی بھی نوبت آئی ہے۔ قتل و خونریزی کی بھی لیکن الساطوکیت پرستی کی بنا پر نہیں ہوا ہے بلکہ حق کی خاطر۔ یہ تو تمہارا شیوہ ہے کہ متاع دنیا کی ہوس میں اپنا ایمان و ضمیر سب قربان کر دیتے ہو اور طلب دنیا میں ایسی شرمناک صورتیں اختیار کر رکھی ہیں کہ اگر سنتہ اللہ نافع نہ ہوتی تو زمین شق ہو جاتی اور تم ہمیشہ کے لیے اس میں سما جاتے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہود کی مسلمانوں کے خلاف تگ و دو کی اصلی وجہ دینی و دنیاوی رسوخ کا تحفظ تھا۔ اس کے بچاؤ کے لیے باوجود اس کے کہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث من اللہ ہیں انکار کرتے تھے۔ انکار ہی نہیں لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے بھی تھے۔ اسی ذلیل مقصد کے لیے یہ فتنہ کھڑا کیا تھا۔ اس پر خدا نے انھیں سخت ڈانٹ بتائی گو بظاہر خطاب کفار سے ہے لیکن در پردہ یہودیوں پر ضربیں لگائی ہیں اس لیے کہ تمام فتنوں کے سرچشمہ وہی تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیات مسئول عنہا کے الفاظ سے بھی ہماری تاویل نکلتی ہے یا نہیں اس کے لیے ضرورت ہے کہ کلمات ذیل کی تحقیق کی جائے۔

حتّٰی۔ تریدون عرض الدنیا۔ کتاب۔ فیما اخذتم۔

(۱) حتّٰی۔ لفظ حتّٰی ہمارے نزدیک یہاں پر غایت کا نہیں ہے بلکہ ترقی کا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کلام عرب میں یہ لفظ اس معنی میں آتا بھی ہے یا نہیں چونکہ جو معنی ہم لے رہے ہیں عام لوگوں کے نزدیک غریب ہے اس لیے اس کی تائید میں کلام عرب سے چند شہادتیں نقل کرتے ہیں۔

فرزدق کہتا ہے۔

فیا عجبا حتّٰی کلیب تسبنی   کان اباہ نہشل او مجاشع

حیرت ہے کہ قبیلہ کلیب تک میرے منہ لگ رہا ہے۔ گویا کہ اس کا جدِ امجد نہشل ہے یا مجاشع۔

ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

القی الصحیفۃ کی یخفف رحلہ　　　والزاد حتی نعلہ القاھا

اس نے صحیفہ اور توشہ زمین پر ڈال دیا تاکہ اثاثہ کم ہو جائے حتی کہ کفش پا تک گرا دیا۔

یہ جملہ تو سب کے زبان زد ہوگا۔۔۔ مات الناس حتی الانبیاء۔

(۲) "تُرِیدُونَ عَرَضَ الدُّنیا" ہم کہہ چکے ہیں کہ آیات مسئول عنہا سوالات مقدرہ کے جواب میں واقع ہیں بالفاظ دیگر یہ آیات یہودیوں کی حماقتوں کا دندان شکن جواب ہیں۔ اس لیے تریدون کا خطاب ہمارے نزدیک بظاہر تو کفار کی جانب ہے لیکن درپردہ اصل رُوئے سخن یہودیوں پر ہے۔ اس لیے کہ وہی ان کے استاد اعلیٰ تھے، وہ جو کچھ سکھاتے تھے یہ اسے قبول کر لیتے۔ اور یہ جواب بھی انھیں کی حالت سے لگتا ہوا ہے اس لیے کہ دنیا میں جتنی قومیں بستی ہیں ان میں سب سے زیادہ دنیا پرست یہود قوم ہے اس نے دنیا کے پیچھے اپنے مذہب کو محرف کر ڈالا اور نہ معلوم کیا کیا ذلتیں اٹھائیں لیکن اس کی آنکھیں نہ کھلیں اور اسی نے اس آخری رسول کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا حالانکہ ان کی کتاب (توراۃ) کا حکم تھا کہ اس کی پیروی کرو لیکن برا ہو طمع کا۔

(۳) 'کتاب' کتاب کا لفظ قرآن میں بے شمار معانی میں آتا ہے کہیں تو اس سے کتاب آسمانی مراد لیتے ہیں اور کہیں اعمالنامے اور بعض جگہ لوح محفوظ کے لیے آیا ہے اس کی تعیین سیاق و سباق سے ہوتی ہے۔ یہاں پر کتاب سے مراد ہمارے نزدیک سنت اللہ یا قانون الٰہی ہے۔ جیسا کہ سورۂ حجر میں مذکور ہے۔

وَمَا اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا وَلَھَا کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (حجر)　　ہم نے کسی بستی کو نہیں تباہ کیا مگر اس کی اجل معین یا قرار دادہ فیصلہ پر۔

(۴) اخذ، اخذ کا مفہوم ہمارے نزدیک یہاں پر "اختیار" کرنا ہے سوال یہ ہے کہ لغت بھی اسی معنی

کی تائید کرتی ہے یا نہیں۔ چونکہ جام تاویل کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مفہوم ذرا غریب ہے اس لیے اس معنی کی تائید ہم مستند لغت سے کریں گے۔

لسان العرب میں ہے۔

والعرب تقول لو کنت منا لاخذت باخذنا ای بخلایقنا و زینا و شکلنا و ھدینا۔ (لسان العرب جزء خامس)	اہل عرب یوں کہتے ہیں اگر تم ہم میں سے ہوتے تو ہمارے اطوار اور طرز رہائش اختیار کرتے۔

اور یہ جملہ ہر شخص روزانہ کی بول چال میں استعمال کرتا رہتا ہے، خذ ہذا او ذاک۔ اب تو میں یہ کہوں گا کہ اخذ کا لفظ جس معنی میں بھی آتا ہے ہر ایک کا معنوی قدر مشترک یہی ہے۔ یا یوں کہیے کہ اسی دروازہ میں آکر اور صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

خلاصۂ مباحث تفصیل بالا سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ آیات مسئول عنہا کے ماتحت تفسیر کی کتابوں میں جتنے شان نزول مذکور ہیں ان میں سے ایک بھی نہ تو میزان قرآن ہی پر پورا اترتا ہے، اور نہ عقل پر اور نہ موقع محل ہی آئینے عتابوں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آیات مسئول عنہا یہودیوں کے اعتراضات کے جواب میں واقع ہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ بدر کی فتح نے یہودیوں کو سراپا غیظ و غضب بنا دیا تھا اس لیے انہوں نے داعی اسلام اور جان نثاران محمدؐ پر مذہبی رنگ میں اعتراضات کی بارش شروع کر دی چونکہ وہ صاحب کتاب تھے اور ادعا بھی بڑی شد و مد سے کرتے تھے اس لیے ان کی پر فریب باتیں ضعفاء قلوب کے لیے تو باعث اضطراب ہوتیں اور کفار کے لیے مزید وحشت و نفرت کا سبب۔ اس لیے وحی الٰہی نے ان کے دجل و فریب کے تمام تو بر تو پردوں کو چاک کر کے حقیقت بے نقاب کر دی سہولت کے لیے ہم سوالات مقدرہ اور جوابات نمبروار نقل کرتے ہیں۔

سوالات مقدرہ۔

(۱) "نبی تو سارے عالم کے لیے رحمت بن کر آتا ہے لیکن یہ مدعی نبوت تو سراپا عذاب ہے دیکھتے نہیں قتل و خونریزی کا بازار گرم کر رکھا ہے"۔

(۲) مال غنیمت کو اتباع محمدؐ نے جائز کر لیا ہے حالانکہ یہ مال کسی نبی کے لیے بھی جائز نہ تھا ارے ایسا تو اس نے لوگوں کو لوٹنے گھسوٹنے کے لیے کیا ہے'۔

جوابات۔

(۱) قید و بند کرنا بھی نبی کے شایان شان نہیں قتل و خونریزی تو نبی کی شان جلالت کے سراسر منافی ہے یعنی نبی تو سراسر رحمت ہے اور سب کو رحمت کا مجسمہ بنا دینا چاہتا ہے لیکن پرستاران باطل اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں چونکہ اس کے ساتھ حق ہوتا ہے اور خدا کو حق کی مظلومیت کبھی نہیں پسند ہے اسی لیے بسا اوقات عذاب الٰہی باد صرصر کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے اور کبھی خسف ارض کی صورت میں اور بعض اوقات خدا مٹھی بھر آدمیوں میں وہ عزیمت پیدا کر دیتا ہے کہ پرستاران باطل کے بڑے بڑے لشکر ان کی مقاومت سے عاجز رہتے ہیں"۔

(۲) اے مسلمانو! اگر ان کا یہ خیال صحیح بھی ہو کہ مال غنیمت پہلے حرام تھا تو اب وہ حلال کر دیا گیا ہے اب اس کے استعمال میں جھجک نہ ہونی چاہیے رہے ان کے اعتراضات تو اس کی پروا نہ کرو کیونکہ یہ سب حماقتیں وہ تمہاری بڑھتی ہوئی ترقی کو دیکھ کر کر رہے ہیں، وہ تو تمہاری ہر روش کو خواہ کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو برا بھجیں گے، اسی لیے آیات مسئول عنہا کے بعد والی آیت (فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) میں مال غنیمت کو حلال طیب کہا یعنی یہودیوں کا اعتراض سراسر باطل ہے اور پھر وَاتَّقُوا اللّٰهَ کہا یعنی مال غنیمت تو جائز ہے لیکن کہیں اس کے حصول کو کار ثواب نہ سمجھ لینا۔ بلکہ اگر لڑائی میں مل جائے تو اس کے استعمال میں قباحت نہیں۔ مگر اس کے لیے جنگ کرنا کبھی جائز نہیں۔

ترجمان القرآن ۔ ہمارے نزدیک آیت کی جو تاویل فاضل مضمون نگار نے بیان کی ہے صحیح نہیں ہے۔ آیت کی تاویل کے لیے اس کے سیاق و سباق پر نظر کرنا ضروری ہے۔ سورۂ انفال میں تو رکوع کے آغاز سے آخر سورہ تک تمام تر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے ہے۔ کسی ایک آیت میں کوئی ایک اشارہ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس سے یہ شبہہ کیا جا سکتا ہو کہ ان آیات میں کسی اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ پھر اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ خطاب یہودیوں ہی سے ہے تو فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ کا خطاب کس سے ہوگا؟ ایک ہی سلسلہ کلام میں کہیں مسلمانوں سے خطاب اور کہیں یہودیوں سے خطاب اور پھر کوئی قرینہ بھی ایسا نہیں جس سے دونوں خطابوں میں تمیز کی جا سکتی ہو، کلام کو اس قدر مہمل بنا دیتا ہے کہ اسے خدا کی طرف منسوب کرنا تو درکنار کسی فصیح البیان آدمی کی طرف بھی منسوب کرنا درست نہ ہوگا۔ مزید براں جو کچھ تاویل صاحب مضمون نے لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ کی فرمائی ہے وہ ایک ہی آیت کے بعد خود قرآن کے بیان سے ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ اس آیت کے معنی یہ کرتے ہیں کہ اے یہود! طلب دنیا میں تم نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اگر سنت اللہ مانع نہ ہوتی تم پر سخت عذاب آتا"۔ لیکن آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ (اے نبی تمہارے پاس جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ اگر اللہ دیکھے گا کہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی ہے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے وہ اس سے بہتر چیز تم کو دے گا) یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ اوپر والی آیت میں فیما اخذتم سے مراد وہی فدیہ ہے جو ان قیدیوں سے لیا گیا تھا۔

ہمارے نزدیک کسی خیالی اعتراض سے بچنے کے لیے قرآن کے معانی میں اس قدر بعید تاویلیں کرنا درست نہیں جن کا ساتھ نہ تو قرآن کے الفاظ دیتے ہوں، نہ عبارت کا سیاق و سباق، نہ مشہور روایات ان کو علماء امت کی اکثریت نے تسلیم کیا ہو۔ اگر صاحب مضمون خود قرآن مجید کی مدد سے اس آیت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے تو ان کو اس قدر تکلف کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔ سورۂ محمدؐ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (رکوع اول)

پس جب کفار سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب اچھی طرح کچل دو تب انھیں باندھ لو پھر یا تو ان کے ساتھ احسان کرو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو تا کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔

ابن عباس اور دوسرے مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ آیت جنگ بدر سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی اس میں جنگ کے ابتدائی اصول مسلمانوں کو یہ بتائے گئے تھے کہ:۔

(۱) پہلے کفار کو اتنا مارو کہ ان کا زور ٹوٹ جائے۔

(۲) پھر قید کرو۔

(۳) پھر چاہو احسان کا سلوک کرو اور چاہو تو فدیہ لے لو۔

اس کے بعد معرکہ جنگ پیش آیا۔ جب مشرکین شکست کھا کر بھاگنے لگے تو مسلمانوں نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا اور ان کے تقریباً ستر آدمی گرفتار کر لیے۔ مدینہ واپس جانے کے بعد حضور اقدس نے صحابہ کی کونسل میں یہ مسئلہ پیش کیا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ مختلف حضرات نے مختلف رائیں دیں۔ حضور نے حضرت ابوبکر کی رائے کو پسند فرمایا اور قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ یہ بات منشاء الٰہی کے خلاف تھی۔ اگرچہ حق تعالیٰ نے قیدی پکڑنے اور ان سے فدیہ قبول کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر حکم یہ تھا کہ پہلے اثخان ہونا چاہیے، یعنی پہلے کفار کا زور اتنا توڑ دیا جائے کہ انہیں دوبارہ مقابلہ میں آنے کی جرات نہ ہوسکے، اس کے بعد تم ان کے آدمیوں کو پکڑ سکتے ہو اور پھر ان قیدیوں کو اخذ فدیہ کے بعد رہا بھی کرسکتے ہو یہاں ایک اجتہادی غلطی پیش آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو جدید قانون جنگ کے تحت لڑائی کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔ پھر عمل اثخان جس پر شد وثاق اور اخذ فدیہ کی اجازت موقوف تھی کسی ایسے ضابطے سے منضبط بھی نہ تھا جس سے واضح طور پر یہ معلوم کیا جاسکتا ہو کہ اثخان کی شرط پوری کرنے کے لیے کفار کی کس حد تک

سرکوبی کافی ہو گی۔ حضورؐ اور عام مسلمان یہ سمجھے کہ کفار کا شکست کھا کر بھاگ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا زور ٹوٹ گیا اور اثخان کی شرط پوری ہو گئی۔ لہٰذا صحابۂ کرام نے کفار کا پیچھا چھوڑ کر ان کے اموال پر قبضہ کر لیا ان کے آدمیوں کو پکڑ لیا، اور پھر حضور اکرمؐ نے صحابہ کے مشورہ سے فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ بھی دیا۔ حق تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمائی کہ تمہارے اجتہاد میں غلطی ہے۔ اثخان ابھی نہیں ہوا تھا تم قبل از وقت غنیمت لوٹنے اور قیدی پکڑنے میں لگ گئے۔ ابھی تم کو اور زیادہ مارنا چاہیے تھا تاکہ کفار پر رعب بیٹھ جاتا۔ اس کے بعد تم نے مزید غلطی یہ کی کہ عجلت سے کام لے کر ان قیدیوں کا فدیہ قبول کر لیا۔ اس میں تمہارے لیے سخت خطرہ ہے۔ یہ لوگ پھر دشمنوں سے جا ملیں گے۔ اور ان کی قوت میں اضافہ ہو گا۔ یہ دونوں کام تم نے ہماری شرط پوری کرنے سے پہلے کیے ہیں۔ اور ان پر ہم تمہیں سزا دے سکتے ہیں، مگر چونکہ اجازت بہرحال ہم پہلے دے چکے تھے، لہٰذا اب معاف کیا جاتا ہے۔ جو کچھ تم نے لیا ہے، جاؤ اسے کھاؤ پیو مگر آئندہ احتیاط رکھنا۔

اس تشریح کے بعد پوری آیت پڑھیے مفہوم بالکل واضح ہو جائے گا اور تمام شکوک و شبہات خود بخود رفع ہو جائینگے

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۔ ایک نبی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں۔ پہلے اس کو زمین میں خوب اثخان کرنا چاہیے تاکہ اس کی طاقت کا سکہ بیٹھ جائے۔ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۔ تم دنیا کے فائدے یعنی غنیمت اور مال فدیہ چاہتے ہو مگر اللہ کو تمہاری آخرت کی فکر ہے اور وہ زبردست با تدبیر ہے۔ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ اگر خدا کی اجازت اس سے پہلے سورۂ محمد میں نہ آچکی ہوتی تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر سخت عذاب تمہیں آلیتا فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۔ گو تم نے ہمارا مقصد سمجھنے میں غلطی کی مگر چونکہ ہماری اجازت ہی سے فائدہ اٹھایا ہے لہٰذا جو کچھ تم نے لیا وہ حلال و طیب ہے اسے کھاؤ۔ ہاں مگر احتیاط رکھو اور اللہ کے غصہ سے ڈرتے رہو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ تفسیر جو ہم نے بیان کی ہے اس سے ملتی جلتی تفسیر پہلے محققین نے بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص الحنفی جلد ۳ صفحہ ۹۰ اور تفسیر کبیر للامام الرازی جلد ۴ ص ۳۸۰ تا ص ۳۸۹

مطبوعات

قرآنی غلطیاں

علامہ سید سلیمان ندوی کی

یہ ۵۰ صفحات کا ایک رسالہ ہے جس میں مولانا سید سلیمان ندوی کی متعدد تصنیفات سے ۱۱ غلطیاں نکال کر ان پر مفصل تنقید کی گئی ہے۔ اب سے تقریباً ایک سال یا کچھ زیادہ مدت قبل یہ تنقیدات دہلی کے ایک رسالہ میں شائع ہوئی تھیں۔ سرسری نظر سے ہم نے بھی ان کو دیکھا تھا۔ کوئی غیر معمولی بات ان میں محسوس نہ ہوئی، اس لیے کہ ہر صاحب قلم کے مضامین اور تصانیف میں کچھ نہ کچھ فروگذاشتیں رہ جاتی ہیں اور ان پر تنبیہ کرنا کوئی گناہ نہیں بلکہ ایک علمی خدمت ہے۔ مگر ان تنقیدی مضامین کی اشاعت کے بعد فاضل تنقید نگار کا ایک خط ہمارے پاس آیا جس میں ان مضامین کے متعلق رائے طلب کی گئی تھی یہ غیر معمولی طریق کار دیکھ کر ہم کو شبہ ہوا کہ تنقید سے مقصود شائد کچھ اور ہے، کیونکہ محض اصلاح چاہنے والے لوگ تنقید کرنے کے بعد لوگوں سے رائے طلب کرتے نہیں پھرتے ہیں۔ یہ محض ایک کھٹک تھی جو اس وقت دل میں پیدا ہوئی۔ چنانچہ ہم نے ان دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات کی بنا پر جو تنقید نگار کے والد مرحوم اور ہمارے درمیان تھے اُن کو لکھا کہ تنقید شائع کر دینے کے بعد آپ اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔ اب تشہیر کی کوشش مناسب نہیں لیکن افسوس کہ جو چیز اسوقت ہمیں کھٹکی تھی وہی اب اس رسالہ کی صورت میں ظاہر ہوئی کسی "جماعت خدام القرآن" کا ان مضامین کو دوبارہ شائع کرنا اور پھر مفت تقسیم کرنا، اور اس پر ایک درجن سے زیادہ علمار کی تقریظیں بطور سند نقل کرنا اور چند معمولی فروگذاشتوں کو باصطلاح جدید "سنسنی خیز" انداز میں پیش کرنا گویا اسلام کے خلاف دور حاضر کے کسی باطنی ملحد کی نہایت ہی خطرناک سازش کا انکشاف ہوا ہے، یہ سب باتیں صاف ظاہر کر رہی ہیں کہ اس علمی و دینی خدمت کی تہ میں کیا چیز کام کر رہی ہے۔

جن غلطیوں پر اس رسالہ میں تنقید کی گئی ہے، ان کے متعلق کسی اظہار رائے کی ضرورت ہم محسوس نہیں کرتے۔ اس لیئے کہ ان میں سے بعض کی اصلاح خود مولانا سید سلیمان ندوی نے کر دی ہے اور بعض ایسی ہیں جن کو "غلطی" سے تعبیر کرنا ہی درست نہیں کیونکہ وہ دراصل اختلافِ تاویل و تعبیر کے ذیل میں آتی ہیں جس کے لیے قرآن مجید میں کافی

گنجائش ہے یہاں ہم جس چیز کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی سے جتنی غلطیاں ہوئی ہیں ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس کی حیثیت تسامح یا فروگذاشت سے زیادہ ہو، اور کون سا مصنف دنیا میں ایسا ہوگا جس کا قلم اس قسم کے مسامحات سے محفوظ رہا ہو لیکن ہماری قوم کے علماء اور خدام دین کو دیکھیے کہ وہ ان فروگذاشتوں پر کن الفاظ میں اظہار رائے فرماتے ہیں۔

"مذہب کے نام پر زندگی گذارنے والے مذہب کے ساتھ ایسی عداوت پر کیوں تل جاتے ہیں (ناشر صدق)

"مولانا نے قرآن مجید کی آیات کے متعلق جو لفظی اور معنوی تحریف کی ہے اور صحیح واقعات کو مسخ کیا ہے اس نے ان کے نصب العین اور دیرینہ مقصد کو بے نقاب کر دیا" (ایک مفتی)

(فاضل تنقید نگار) "ایک زبردست فتنہ کے انسداد کا بیڑا اٹھا رہے ہیں" (ایک حضرت العلامہ)

"آپ نے امت مرحومہ پر زبردست احسان فرمایا کہ ندوی کی تفسیر بالرائے کی غلطیاں اور خلاف اسلام موشگافیوں کو طشت از بام فرما دیا تاکہ ندوی صاحب کے مزخرفات و مغویات سے متاثر ہو کر کوئی مسلمان ورطۂ ہلاکت و ضلالت میں نہ گرپڑے" (ایک دوسرے حضرت العلامہ)

"یہ وہ فحش اور ارادی غلطیاں ہیں جو مولانا کے پیکر عقیدت کو عریاں کر رہی ہیں... مولانا کی اکثر و بیشتر علمی خدمات کا مفاد دین خالص کی تبلیغ و اشاعت کے بجائے صرف الحاد اور اہمال کے جراثیم پیدا کرنا ہے" (مصنف رسالہ)

غور کیجیے ان چند فروگذاشتوں پر اس جوش غضب اور شدت کلام کی وجہ کیا ہے؟ وہی گروہ بندی جس پر ان صفحات میں ہم بار بار ماتم کر چکے ہیں۔ خود اپنی جماعت کا کوئی شخص خواہ کتنی ہی غلطیاں کرے اس پر خاموش رہو بلکہ اس کی حمایت کرو۔ دوسری جماعت کا کوئی شخص اگر غلطی کرے تو اس کی مدت العمر کی خدمات دینی سے آنکھیں بند کر کے اس کو بدنیت دشمن اسلام ثابت کر دو۔ یہ ہے وہ اسپرٹ جو ہم کو ہر طرف مسلمانوں میں اور خصوصاً علماء اسلام کی جماعتوں میں نظر آ رہی ہے، اور ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ قوم آخر کدھر جانا چاہتی ہے؟ (ا - م)

"سچ" کے بجائے "صدق"

یکم مئی ۳۵ء ۲۷ محرم ۵۴ھ ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر ہر مہینہ کی یکم گیارہ اور اکیس کو شائع ہوتا ہے ہم کو معلوم ہے کہ صاحب ذوق حضرات جو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے طرز انشاء کے عاشق ہیں اور آپ کے مخصوص دلنشین طرز صحافت کیلئے آپ کے اخبار سچ کے بند ہونے کے بعد سے بیتاب تھے۔ اس مژدہ کو صحیح معنوں میں مژدہ سمجھیں گے لیکن چونکہ ہمارے پاس اخبار سچ کے خریداروں کی مکمل فہرست موجود نہیں ہے اس وجہ سے ہم فرداً فرداً خریداران سچ کو نمونہ روانہ کر سکے۔ لہٰذا شائقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی چار روپیہ جلد از جلد روانہ فرما کر خریداران کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرالیں۔ نہ بعد کو پچھلے پرچے دستیاب نہ ہونے پر پچھتانا پڑے گا۔ "صدق" ہر اعتبار سے سچ سے بڑھا ہوا ہے معنوی حیثیت سے مضامین قرآنی کا اضافہ۔

سالانہ چندہ للعہ ترسیل زر بنام مینیجر اخبار "صدق" ۱۲۳ ہیوٹ روڈ لکھنؤ

مجاہد اعظم شاہ اسمٰعیل شہیدؒ زندہ ہیں

شہید ملت اسمٰعیل یا اللہ کی حجت ✣ تڑپ اٹھتی ہے روح مسلم آجاتی ہے نام اسکا
وہ خود بھی زندہ ہے اور زندہ ہے تعلیم بھی اسکی ✣ خدا کے دشمنوں سے جنگ کرنا ہے پیام اس کا
ہنوز اسکی جماعت زندگی کا درس دیتی ہے ✣ کہ اسکی موت ہی ہے زندۂ جاوید کام اس کا

مرد مجاہد حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ دہلوی کے پیغام کا منادی اور انکی تحریک احیاء توحید و سنت کا علمبردار الفرقان بریلی ہے جو تین سال سے دنیا کو شہید موصوف کا پیغام سنا رہا ہے۔ اسوقت شہید ممدوح کی یادگار میں اسکا "شہید نمبر" نہایت آب و تاب سے نکلا ہے جسمیں قریباً ڈیڑھ سو صفحات پر حضرت شہیدؒ کی سوانح حیات، آپکی دینی و ملی خدمات، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے آپکے مجاہدانہ اقدامات، آپکی جنگ حریت، آپ کی تحریک احیاء توحید و سنت کا نہایت مفصل اور مکمل تذکرہ ہے۔ آپ کی شان میں بہترین نظمیں ہیں۔ اور باطل پرستوں نے آپکے خلاف جو الزامات تراشے ہیں انکا نہایت زبردست اور بلیغ رد کیا گیا ہے۔ اگر ناپسند ہو تو واپسی کی شرط ہے۔ قیمت [illegible] کاغذ اعلیٰ، [illegible] کاغذ معمولی

سالانہ چندہ الفرقان۔ قسم اول ۳ـــ۔ قسم دوم ۲ـــ

خاص رعایت۔ عید الفطر تک خریدار ہونیوالوں کو شہید نمبر بھی مفت دیا جائیگا۔ اور ہر کسی چندہ میں رعایت ہوگی۔

ہر قسم خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:۔ **ناظم دفتر رسالہ الفرقان بریلی (یوپی)**

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف

تمدن عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ
نواب جیون یار جنگ بہادر بی. اے بیرسٹر ایٹ لا منصرم چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے

عالمانہ، مبصرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۳۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ
جس کی قیمت پچاس روپے تھی مگر سو روپیے میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اب

اعلیحضرت فرمانروائے دکن مدظلہ

کے جشن سیمیں کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہوچکی ہے
قیمت صرف پچیس روپیے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

عبدالقادر

پبلیشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چارمینار
حیدرآباد دکن
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن